کالا چور

ابراہیم جلیس

پبلشرز ○ لاہور

کالاچور

ابراہیم جلیس

کالا چور

پائنیر پبلشرز (رجسٹرڈ)

۶۵- ٹمپل روڈ- لاہور

قیمت.......... ڈیڑھ روپیہ

تعداد طبع اول ..... گیارہ سو

پرنٹر.......... سویرا آرٹ پریس لاہور

پبلشرز .... پائنیر پبلشرز لاہور

ناشر........ ایس۔ ایم حسین

فہرس

آؤ عطاء الرحمٰن کو دفن کریں

عطاء الرحمٰن کو مرے ہوئے اتنے دن گزر چکے ہیں کہ اب لوگ اسے بھول چکے ہونگے لیکن میں یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ لوگ عطاء الرحمٰن کو بھول جائیں۔ اسی لئے میں عطاء الرحمٰن کی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر لوگوں کے درمیان آ گیا ہوں۔

آپ عطاء الرحمٰن کو نہیں جانتے وہ کوئی مشہور یا بدنام آدمی بھی نہ تھا۔ میں خود بھی اسے نہیں جانتا تھا جس دن وہ مر گیا اسی دن مجھے معلوم ہوا کہ عطاء الرحمٰن نام کا بھی کوئی بہادر آدمی پاکستانی قوم کا ایک فرد تھا۔

اس کا شمار قوم کے ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو زندگی بھر مرے ہوئے آدمیوں

کی طرح دنیا کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور جب آتے ہیں تو چند لمحوں کے لئے دنیا کی نظروں کے سامنے آتے ہیں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتے ہیں

جن چند لمحوں کے درمیان وہ دنیا کی نظروں کے سامنے آیا اتنے ہی مختصر عرصے میں مجھے عطاء الرحمٰن کی چھوٹی اور غیر دلچسپ سوانح حیات سے واقفیت ہوئی۔ میں صرف اتنا ہی جان سکا کہ اپریل ۱۹۵۲ء کے دن بیڈن روڈ لاہور کے ایک تنگ و تاریک مکان میں بھوک اور بیروزگاری سے تنگ آکر اس نے خودکشی کر لی۔ وہ امرتسر کا ۲۰ سالہ مہاجر تھا جو سڑک پر خوانچہ لگا کر چھوٹی موٹی چیزیں بیچا کرتا تھا۔ وہ جتنا غریب تھا اس کی آمدنی اس سے بھی زیادہ غریب تھی۔ اس نے بڑی اذیت ناک کفایت شعاری کے بعد چھ ستار روپے پس انداز کر کے بطور امانت اپنی بوڑھی ماں کے پاس رکھ دیئے لیکن شاید وہ پھر ڈر گیا کہ اتنی مصیبتوں سے یہ ایک ایک پیسہ جوڑی ہوئی "رقم خطیر" کہیں اس کی ماں نہ غصب کر لے اس لئے اس نے اس رقم میں سے ساڑھے پانچ روپے بطور قرض لے لئے اور افیون کی ایک دکان پر جا کر اپنے لئے موت خریدی پھر رات کے اندھیرے میں وہ اس موت کو اسی طرح چوری چھپے اپنے گھر لے آیا۔ جیسے کوئی فاحشہ عورت کو پکڑ لایا ہو ——— پھر اس کے بعد اس نے اپنی ماں کو ایک چٹھی لکھی:-

والدہ صاحبہ!

بعد تسلیمات کے بعد واضح ہو کہ میں بیروزگاری سے تنگ آ گیا تھا اس لئے میں نے آپ سے جو ساڑھے پانچ روپے قرض لئے تھے اس سے ایک تولہ افیون خریدی ہے اور اب ہمیشہ کے

لئے آپ لوگوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے جا رہا ہوں۔

میرے بعد میری بدنصیب بہنوں کو سلام کہنا

آپ کا بدنصیب بیٹا

عطاء الرحمٰن

اس کے بعد اپنے بستر کے سرہانے یہ ننھی سی تحریر چھوڑ کر وہ راتوں رات چپکے سے موت کے ہمراہ اس دنیا سے فرار ہو گیا۔

اس کے باوجود کہ وہ کوئی بڑا مشہور آدمی نہیں اس کی موت کی خبر چار پانچ سطروں میں ملک کے سارے اخباروں میں چھپی لیکن اس کی موت پر سوائے اس کی بوڑھی ماں اور دو بہنوں (اور شائد کسی کنواری دوشیزہ کے جو کنکھیوں سے اسے دیکھا کرتی ہو) کسی کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ بلکہ لوگوں نے اس کی موت پر ناک بھویں چڑھائیں۔ کسی نے اس پر حرام موت مرنے کا الزام لگایا اور کسی نے اس بہادر نوجوان کو بزدل کہا جو زندگی سے ڈر کر بھاگ گیا۔

عطاء الرحمٰن پر ان دونوں الزامات کو میں نہیں مانتا۔ میں تو یہ بھی نہیں تسلیم کرتا کہ وہ حرام موت مرا ہے۔ کوئی مجھے سمجھائے کہ وہ حرام موت کس طرح مر سکتا ہے جب کہ وہ ہر روز ایک حرام زندگی گزارتے گزارتے تھک گیا تھا ——

کون اس کو بزدل کہہ سکتا ہے۔ جبکہ وہ ایک بھری پُری خوبصورت دنیا، ماں کی محبت بھری آغوش، بہنوں کے انمول پیار، اپنی ۲۰ سالہ بھرپور جوانی کی بہار اور شائد کسی شہد آگیں جسم کی لذتوں کو ٹھوکر پر لگا کر ان جانے آسمانوں کی طرف چلا گیا۔ ان نعمتوں کو کوئی مجھ جیسا عام آدمی ہرگز نہیں ٹھکرا سکتا۔ اس کے لئے بڑا جگرا اور بڑا

حوصلہ چاہیے اور اس لحاظ سے عطاء الرحمٰن ایک بڑا جگردار اور بڑا حوصلہ مند
اور بڑا بہادر نوجوان تھا۔

اُس نے ایک ذلیل زندگی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے ایک باعزت
موت کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اپنی مجبور بہنوں کو بازار میں نہیں لے گیا۔ اس نے اپنی
پیاری ماں کے آگے بھیک کے ٹکڑے نہیں رکھے۔ زندگی اس سے جو ذلیل کام
کروانا چاہتی تھی اس نے وہ نہیں کیا۔ اس کی غیرت زندگی کے آگے کبھی نہیں جھک
سکی۔ وہ زندگی کے عین مقابل سے سینہ تان کر اور سر اونچا کر کے گزر گیا۔ ایک فاتح
کی طرح زندگی کو نیچا دکھا کے چلا گیا۔

...... لیکن اس کی بہادری کے یہ مناظر کسی نے نہیں دیکھے اور کوئی
کس طرح دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس کے چھوٹے سے گھر میں بڑا بھیانک اندھیرا تھا
جہاں شاید مٹی کے تیل کا دیا بھی نہ جلتا ہو ——— وہ زندگی بھر اندھیرے
میں رہا وہ جب اس دنیا میں آیا تو اندھیرے میں آیا اور جب اس دنیا سے چلا
گیا تو اندھیرے ہی میں چلا گیا۔ صرف اس کے بعد چند لمحوں کے لئے اس کا نام اُجالے
میں آیا اور شاید یہ بتانے کے لئے آیا کہ اس ملک میں عطاء الرحمٰن نام کا بھی کوئی بہادر
نوجوان تھا یا پھر اس ملک میں سیکڑوں ایسے عطاء الرحمٰن ہیں جو دنیا کی نظروں سے
اوجھل زندگی سے لڑتے رہتے ہیں اور آخر کار زندگی کو موت کے گھاٹ اُتار کر
اس دنیا سے چلے جاتے ہیں وہ اپنی اس بہادری کے عوض نہ کوئی انعام اکرام
طلب کرتے ہیں اور نہ داد تحسین کی انھیں کوئی پروا ہوتی ہے۔

اب مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے ملک کے اس بہادر نوجوان سے

کبھی نہیں ملا۔ اس کی تصویر تک میں نے نہیں دیکھی۔ اور اب تو وہ اتنی دور چلا گیا ہے کہ اب وہ کبھی بھی نظر نہیں آ سکتا ہے البتہ اس کے قدموں کی اڑائی ہوئی خاک کا ایک ڈھیر کسی قبرستان میں رہ گیا ہے جس پر اس کی بوڑھی ماں اور دو بہنیں پھول بکھیر رہی ہیں اور آنسوؤں کی شمعیں جلا رہی ہیں ــــــــ میں نے اس کے قدموں کی اڑائی ہوئی خاک کا وہ ڈھیر بھی نہیں دیکھا۔ وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا کیونکہ اب وہ اس خاک کے ڈھیر میں بھی نہیں ہے وہ آسمانوں پر بھی نہیں ہے وہ تو جیسے پھر اسی زمین پر لوٹ آیا ہے۔

اس کی موت کے بعد سے جب کبھی میں اپنے اردگرد نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ہر شخص عطاء الرحمٰن معلوم ہوتا ہے حتیٰ کہ جب میں آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہوں تو پھر میری صورت میری نہیں بلکہ عطاء الرحمٰن کی معلوم ہوتی ہے اور پھر جب میں گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو عجیب عجیب ڈراؤنے خواب میری بند پلکوں میں سمٹ آتے ہیں ــــــــ ہر خواب کا ہیرو عطاء الرحمٰن ہی ہوتا ہے مثلاً وہ ایک شاہراہ پر سے گزر رہا ہے اس کے پیچھے ہزاروں کروڑوں انسانوں کا ایک ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں ہر شخص عطاء الرحمٰن کا ہم شکل ہے ــــــــ پھر کوئی بازار نظر آتا ہے جس میں اناج کی دکانوں پر بھوک کا، کپڑے کی دکانوں پر برہنگی کا، کتابوں کی دکانوں پر جہالت کا، دوائیوں کی دکانوں پر موت کا اور زیورات کی دکانوں پر عصمت و آبرو کا مول تول ہو رہا ہے۔ اسی بازار میں فٹ پاتھ پر عطاء الرحمٰن خوانچہ لگائے بیٹھا ہے اس کے ساتھ اس کی ماں اور دو بہنیں بیٹھی ہیں۔ وہاں اچانک ایک قیمتی موٹر کار رکتی ہے جس میں سے ایک بڑی بیگم بالکل ننگی اترتی ہے۔ اور

دیکھتے ہی دیکھتے وہ عطاءالرحمٰن کی ماں اور دونوں نوجوان بہنوں کے جسموں سے
کپڑے کھینچ کھینچ کر اُتار لیتی ہے اور خود پہننے لگتی ہے عطاءالرحمٰن کی ماں
اور اس کی دونوں لڑکیاں اس بڑی بیگم کے جسم کی آڑ میں اپنے ننگے جسموں کو دنیا
کی نگاہوں سے چھپانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن وہ چمکیلی قیمتی کار اسٹارٹ ہوتی
ہے اور فراٹے بھرتی ہوئی سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے عطاءالرحمٰن کو روندتی
ہوئی کچلتی گزر جاتی ہے —— پھر خواب کا منظر بدلتا ہے۔ کھانے کی ایک
میز نظر آتی ہے جس کے ارد گرد چند آدم خور بیٹھے نظر آتے ہیں جن کی پلیٹوں میں
عطاءالرحمٰن کی بوٹیاں اور ہڈیاں ہیں اور جن کے طلائی جاموں میں ساٹھ کروڑ
عطاءالرحمٰنوں کا خون بھرا ہوا ہے —— میں اس عالی شان محل کی کھڑکی
سے جھانکتا ہوں تو مجھے اس کی بنیاد کے پاس ایک چھوٹی سی قبر نظر آتی ہے جس
کے روزن سے کوئی لاش جھانک رہی ہے —— پہلی نظر میں یہ عطاءالرحمٰن کی
لاش نظر آتی ہے لیکن فوراً ہی دوسری نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ایک پوری
قوم کی لاش ہے۔

میں ڈر کر آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ آنکھیں کھل جاتی ہیں لیکن خواب نہیں ٹوٹتا
یہ کیسا خواب ہے جو صرف آنکھیں بند کرنے سے ہی نہیں شروع ہوتا اور آنکھیں
کھلنے پر بھی نہیں ٹوٹتا۔ یہ خواب بھی عجیب...... خواب ہے خواب
بھی ہے اور تعبیر بھی جو سوتے میں بھی نظر آتا ہے اور جاگتے میں بھی....
عطاءالرحمٰن بھی عجیب آدمی تھا میں اس کو جانتا تک نہیں۔ میں نے اسے
کبھی دیکھا تک نہیں۔ لیکن دنیا سے جاتے جاتے وہ مجھے اس خواب کا تحفہ

دے گیا۔ میں بھلا اس کا کون لگتا ہوں ——! میں اس کا یہ تحفہ کس طرح
سنبھال کر رکھ سکتا ہوں۔ میں بھی تو اس کی طرح ایک غریب آدمی ہوں۔
اس نے اپنا یہ تحفہ اپنے قاتل کو کیوں نہیں دیا۔ وہی اس تحفہ کا مستحق ہے
کیا عطاء الرحمن اپنے قاتل کو نہیں پہچانتا۔ ——!!
قاتل ——؟ ہاں عطاء الرحمن نے خودکشی نہیں کی بلکہ اس کو قتل کیا
گیا پچھلے پانچ سال سے چند بیرحم ہاتھ اس کے منھ سے نوالے چھین چھین کر
اس کا گلا گھونٹتے رہے۔ ایک آہستہ "اثر زہر" اس کی رگ رگ میں کافی
عرصے سے اپنا اثر کر رہا تھا حتیٰ کہ وہ ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کو مر گیا۔ کسی کو پتہ نہیں چلا
کہ قاتل کون تھا۔ شاید قاتل کو یہ بھی نہیں معلوم کہ پچھلے پانچ برس سے
وہ سینکڑوں عطاء الرحمنوں کے جسموں سے ان کی پیاری پیاری زندگیاں
کھینچتا چلا جا رہا ہے۔ سینکڑوں مکان ڈھے رہے ہیں اور سینکڑوں قبریں
ابھر رہی ہیں۔ کوئی شور نہیں مچتا۔ کوئی چرچا نہیں ہوتا۔ کوئی قصاص نہیں مانگتا
—— کوئی خون بہا طلب نہیں کرتا۔
یہاں میں اس کی لاش اپنے کندھے پر اٹھا کر اس لئے نہیں آیا ہوں
کہ لوگ اس کی لاش کو دیکھ کر لمبی لمبی آہیں بھریں یا پھر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں
کی بوندیں ٹپک پڑیں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ عطاء الرحمن کو زمین میں دفن کرنے
کے بجائے قہقہوں میں دفن کیا جائے۔ اس کی قبر دنیا کا صرف
ایک قہقہہ ہے۔
وہ آخر کیا تھا گیا ——؟ اس کی موت سے کائنات میں کون سا

خلا پیدا ہو گیا ہے۔ دُنیا کے کون سے کام رُک گئے ہیں؟
اس کا دنیا سے چلے جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سڑک کے کنارے سے کوئی خوانچہ ہٹا دیا گیا ہو۔ کسی بوڑھی عورت کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لیگئی ہو یا پھر اس ضعیفہ کے ساڑھے پانچ روپے چوری ہو گئے ہوں۔ اس کی موت دو جوان لڑکیوں کی آنکھوں کے چند آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کی موت کسی کنکھیوں سے دیکھنے والی دوشیزہ کی آنکھوں کا صرف ایک لمحاتی اندھیرا ہے۔
اسی لئے میں اُسے دفن نہیں کروں گا۔ اس کو دفن کر کے مجھے کتنی خفت اٹھانی پڑے گی۔ جو شخص زندگی بھر دفن رہا ہو۔ اس کو مرنے پر کس طرح دفن کیا جائے ——— ! لوگ مجھ پر ہنسیں گے، لوگ مجھے پاگل کہیں گے۔ لوگ مجھے خود عطاء الرحمٰن سمجھیں گے۔
اس لئے کیوں نہ میں کسی بڑے آدمی کو دفن کروں، کیوں نہ میں عطاء الرحمٰن کے قاتل .... لیکن اے بدبخت عطاء الرحمٰن! تیرا قاتل کون ہے؟ کون ہے تیرا قاتل ——— ؟
کیا وہ تیرے قتل کے بعد بھی جفا سے توبہ نہ کرے گا؟ ؟
نہیں نہیں ——— میں تیری لاش کو اس وقت تک دفن نہیں کرونگا جب تک کہ میں تیرے قاتل کو نہ پکڑ لوں۔
میرے وطن کے بہادر نوجوان ——— ! میں تیری لاش کو سلام کرتا ہوں۔

گرانڈ عید سیل

مجھے جہاں تک معلوم ہے عید کا دن اسلامی دنیا کا ایک مقدس دن ہے جو ہر سال دو بار مسلمانانِ عالم کو خدا کی عبادت، انسانی مساوات اور تزکیۂ حیات کے درس پڑھانے آتا ہے۔ لیکن جب سے میں عید کے دن کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اس وقت سے عید کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ عید کا مذہب سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا کہ تجارت سے ہے یہی وجہ ہے کہ عید کے نام کے ساتھ ہی میرے تصور میں عیدگاہ یا مسجد کے بجائے کوئی ایسی دوکان نظر آتی ہے جس میں موٹے

موٹے حروف میں لکھا ہوا ہے ـــــــ گرانڈ عید سیل۔

مذہب میں اس دن کی کیا اہمیت ہے اس کا مجھے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہے البتہ تجارت میں اس دن کو کیا مقام حاصل ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ یہ دن سال کے باقی دنوں سے نفع بخش یا منافع آور ہے۔ یہ صرف میرا مشاہدہ نہیں بلکہ آپ کا بھی ہوگا کہ جیسے جیسے عید قریب آتی جاتی ہے بازار کی رونق اور چہل پہل میں ویسے ویسے اضافہ ہوتا جاتا ہے ادھر دوکانوں میں عید کا تازہ اسٹاک آرہا ہے تو ادھر بازاروں میں خریداروں کا تازہ اسٹاک گھوم رہا ہے۔

کپڑوں، جوتوں، ٹوپیوں، عطریات، زیورات، درزیوں، دھوبیوں، حلوائیوں، نائیوں، چوڑیوں (ہاتھوں میں پہننے والی) سویوں اور عید کارڈوں کی دوکانوں پر اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ دوکاندار جو سال بھر سر کھجاتے رہتے ہیں انھیں سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ملتی۔ البتہ عید کی وجہ سے بڑھی چڑھی قیمتوں کو سن کر خریدار ضرور اپنا سر کھجا لیتے ہیں۔

عید سے پہلے اور عید کے دن شہر کے بازاروں میں گھما گھمی کو دیکھنا اور اس میں حصہ لینا میرا شروع ہی سے مشغلہ رہا ہے میں صرف اہل وطن کی بڑھی ہوئی قوت خرید اور قوت فروخت ہی کا نظارہ نہیں کرتا ہوں۔ بلکہ یہ بھی دیکھ دیکھ کر لطف اٹھاتا ہوں کہ عید گھریلو محبتوں کو بازار میں کتنا استوار کرتی ہے۔ باپ بیٹے کے لئے، شوہر بیوی کے لئے، بھائی، بہن کے لئے عاشق محبوبہ کے لئے عید کے بہانے جب بھی کوئی چیز خریدتا ہے تو

پھر میں سوچنے لگتا ہوں کہ باپ بیٹے سے، شوہر بیوی سے، بھائی بہن سے اور عاشق محبوبہ سے کتنا قریب آگیا اور آگئی ہوگی۔ میرا خیال ہے اگر بازار کا وجود نہ ہوتا تو عید کی حیثیت بھی جمعہ یا اتوار کی تعطیل سے زیادہ نہیں ہوتی عید کا بازار سے اور بازار کا گھریلو محبت سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ کل جب میں ایک دوکان کے شوکیس کے سامنے کھڑا مختلف قسم کی گھڑیاں دیکھ رہا تھا تو ایک نوجوان اور خوبصورت جوڑا دوکان کے اندر گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر نکلا تو میں نے سنا کہ لڑکا لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو تو میں نے تمہارے لئے کتنی نفیس گھڑی
عید پر تحفہ دینے کے لئے خریدی ہے۔ اب
تو تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔ چلو ایک بار
تو مسکرا دو"

لڑکی سچ مچ مسکرا دی اور میں سوچنے لگا کہ اگر عید نہ آئی تو یہ لڑکا اپنی جو کچھ بھی وہ تھی اس کے لئے گھڑی بھی نہ خریدتا اور اس طرح نہ جانے اس کی محبت کب تک ناراض رہتی اور نہ جانے کب تک بیچارے کو اس پیار بھری مسکراہٹ کے لئے ترسنا پڑتا۔

عید سے پہلے بازار کی گھما گھمی سے میں نے یہ ایک واقعہ برسبیل تذکرہ بتایا ہے ورنہ اس طرح "محبت برائے لیڈیز رسٹ واچ اور رسٹ واچ برائے عید" جیسے سینکڑوں واقعے عید سے پہلے بازاروں میں نظر آتے ہیں۔ کوئی سوٹ پاکر شاش ہے تو کوئی بوٹ پاکر بشاش ہے۔ کوئی اپنی عورت کے

کے لئے سونے کی چوڑیاں خرید کر محبت میں اضافہ کرتا ہے تو کوئی اپنے محبوب کے لئے عید کارڈوں کا لفافہ خریدتی ہے ــــــ گویا عید کیا ہے آپ کی اور میری قوت خرید اور فروخت کی اچھی خاصی امتحان گاہ ہے جس کی قوت خرید زوردار ہے۔ اس کی عید بھی شاندار ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا اور عرصۂ دراز سے دیکھ رہے ہیں کہ عید قریب آتے ہی بازاروں میں دوکانوں کو بڑے اہتمام سے سجایا جاتا یا سنوارا جاتا ہے۔ گویا عید صرف بازاروں کے لئے آتی ہے۔ عید کی آمد کا پروپیگنڈا سب سے پہلے بازاروں میں شروع ہوتا ہے۔ آپ صبح گھر سے نکل کر شام کو جب گھر لوٹتے ہیں تو آپ کے کوٹ، پتلون اور قمیض کی جیبیں ان ہینڈ بلوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں جن میں عید کی بشارت دے کر آپ سے طرح طرح کی درخواستیں کی جاتی ہیں کہ اگر آپ عید کا دن بہترین طریقے پر گزارنا چاہتے ہیں تو ہوٹل میٹروپول تشریف لائیے۔ جہاں عید ڈنر اور عید ڈانس کا بہترین انتظام کیا گیا ہے۔ عید کے لئے ہم نے خاص جوتے تیار کرائے ہیں۔ جن کا نام ہی عید شوز ہے اگر آپ نے عید شوز نہیں خریدا تو پھر شاعر کہے گا۔

ع کیا خاک تیری عید ہے۔

عید اخبار ابوالہول کے عید نمبر کے بغیر نامکمل ہے۔ یاد رکھئے۔ اخبار ابوالہول کا عید نمبر عید کے دن نہایت آب و تاب سے شائع ہوگا اور عید کے بعد آئندہ عید تک بکتا رہے گا ــــــ شہزادی زیب النساء دختر اعلیٰ حضرت محمد محی الدین اورنگ زیب عالمگیر عرش آشیانی کا ایک شعر ہے

ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد
کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

عید کے دن اگر آپ کو کلید مے کدہ نہ ملے تو ہمارے پاس تشریف لائیے
ہم ہیں آپ کے شہر کے شراب فروش ــــــ ہرمزجی فرمزجی باٹلی والا ــــــ
ہماری دکان کا پتہ یہ ہے۔

مری بیٹرا زبسٹ وال روڈ - لاہور

اہالیان لاہور کو عید مبارک اور مژدہ جانفزا
پیلس ٹاکیز میں عید کا شاندار پروگرام

فلم
نا کارہ

عیکر چاند کرگس اور رسالے حبیب لکھار کیا خوب ، ممی اور رحپکو وغیرہ
عید اور زہرہ بائی چنیوٹ والی ریڈیو سنگر

آپ سب برادران اسلام کو بصد عید مبارک پیش کرنے کے بعد یہ اعلان کرتی ہے کہ آپ سب میرے کوٹھے نمبر ۱۱ پر تشریف لائیں ۔کیونکہ ناچیز بندی نے علم موسیقی میں ایک نئے راگ کا اضافہ کیا ہے جس کا نام "عیدی راگ" ہے جو صرف عید کے دن گایا جاتا ہے ــــ دیکھئے یاد رکھئے ، عید کے دن بائی زہرہ بائی چنیوٹ والی کو نہ بھولئے ۔ ورنہ "عیدی" نہ سنئے گا تو بیٹھ کر سال بھر پچھتایئے گا۔

آپ ان سارے ہینڈ بلوں کو سامنے رکھ کر عید کے دن کا جو پروگرام

بناتے ہیں وہ کچھ حسب ذیل قسم کا ہے۔

صبح سویرے۔ حجامت اور شیو فینسی ہیر ڈریسنگ سیلون

غسل۔ جیمے پہلوان کا گرم شاہی حمام

دوپہر ——— عید لنچ ——— کیفے ڈی عید

ناکارہ کا میٹنی شو ——— پیلس ٹاکیز

شام۔ مری بیئر اور اسکاچ وسکی

——— ہرمزجی فرمزجی باٹلی والا

رات۔ عیدی راگ ——— بائی زہرہ بائی چنیوٹ والی کا کوٹھا۔

عید ڈنر ——— ہوٹل میٹرو پول

آدھی رات ——— عید ڈانس ——— ہوٹل پاک پاکٹ

اس پروگرام پر نظر ڈالنے سے آپ بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ عید کا دن فینسی ہیر ڈریسنگ سیلون سے شروع ہو کر ہوٹل پاک پاکٹ یا پھر جیمے پہلوان کے گرم شاہی حمام میں غروب ہو جاتا ہے۔

عید مسلمانوں کے لئے خوشیاں اتنی نہیں لاتی جتنی کہ روپوں کی تھیلیاں لاتی ہے۔ آپ کے گھر کے چھوٹے بچے سے لیکر گرہ کٹ تک کچھ نہ کچھ کما رہا ہوتا ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ عید کن کن کے لئے ان داتا ہوتی ہے۔

سب سے پہلے ہوٹل والوں کو لیجئے۔ جن کے ہوٹل سال کے گیارہ مہینے بھائیں بھائیں کرتے رہتے ہیں۔ انھیں صرف رمضان کے مہینے میں

آمدنی اور ان کی کرسیوں کے کھٹملوں کو انسانی خون پینے کو ملتا ہے اور عید کے دن تو ان کا کیش بکس اتنا بھر جاتا ہے کہ اگر آئندہ گیارہ مہینوں میں انھیں ایک پیسہ کی بھی آمدنی نہ ہو تب بھی انھیں اپنے بیوی بچوں کو میکہ بھیجنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔

عید سے پہلے بازاروں میں خرید و فروخت کی جو گھما گھمی ہوتی ہے وہ عید کے دن ایک پُرامن قسم کی لوٹ مار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر آپ چیرنگ کراس سے انارکلی جانا چاہتے ہیں تو تانگے والا آپ سے پانچ روپے اور ٹیکسی والا آپ سے دس روپے طلب کرے گا۔ حالانکہ عام دنوں میں آپ تانگے کو بارہ آنے یا ٹیکسی کو ڈیڑھ روپیہ زیادہ نہیں دیتے

—— آپ حیران ہو کر پوچھتے ہیں۔

کیوں بھائی! تم نے ہمیں گاؤدی سمجھ رکھا ہے"۔ تانگہ والا اور ٹیکسی ڈرائیور گھگھیا کر کہتے ہیں۔

نہیں، بابوجی! نہیں، آج تو عید کا دن ہے نا۔"

عید کا دن ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم میری جیب کاٹو۔

آپ سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ ٹکٹ نہیں ملتا۔ ایک آدمی آپ کے قریب آتا ہے اور کہتا ہے۔

—— باؤجی! تین روپے کا ٹکٹ پانچ روپے

—— آپ اسے ڈانٹتے ہیں تو وہ کہتا ہے

—— آپ کیا جانیں باؤجی۔ اس دن کا ہم کتنی بے تابی

سے انتظار کرتے ہیں ـــــ آپ ٹکٹ خرید کر سوچنے لگتے ہیں کہ عید کا مارکیٹ کے علاوہ بلیک مارکیٹ سے بھی کتنا گہرا تعلق ہے۔

آپ سینما ہال میں داخل ہو کر جیب سے سگریٹ کیس نکالنا چاہتے ہیں لیکن نہ تو سگریٹ کیس ملتا ہے اور نہ آپکا منی پرس۔ ہاتھ جیب میں گھس کر رانوں تک آ جاتا ہے ـــــ لیجئے آپ کا موڈ پلید اور گرہ کٹ کی عید۔

ابھی سینما کا انٹرول بھی نہیں ہوتا کہ آپکا "ننّھا کاکا" گھبرایا ہوا سینما ہال میں داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے ـــــ اباجی ـــــ جلد گھر چلئے۔ گھر میں چوری ہو گئی، امی اور ہم سب وغیرہ چچا چاچی کے گھر عید ملنے گئے تھے کہ گھر کا صفایا ہو گیا۔ آپ کے گھر کے صفائے کو عرف عام کی عید کہتے ہیں۔

اب آخر میں اپنی عید کے بارے میں آپ کو بتا دوں۔ بلا شبہ عید میرے لئے بھی "اَن داتا" ہے میرا شمار نہ تو دوکانداروں میں ہے اور نہ خریداروں میں۔ البتہ میں ایک مضمون نگار ہوں اور صرف عید پر مضامین لکھتا ہوں۔ اگر آپ کبھی اندرون موچی دروازہ محلہ پیر گیلانیاں میں تشریف لائے ہوں تو آپ نے میری مضمون نگاری کی وہ دوکان بھی دیکھی ہو گی۔ جس پر یہ بورڈ آویزاں ہے۔

البرابلیس اینڈ سنز اینڈ ڈائرز

آپ کے شہر کے مشہور عید پر مضمون تیار کرنے والے اور عید کارڈ نویس۔

میں عید سے پہلے عید کارڈ بیچ کر اور عید کے دن مضامین چھپوا کر خوب

روپیہ کماتا اور کم نماز پڑھتا ہوں۔ میں نے اب تک عید پر کوئی چار سو بیس مضمون لکھے ہیں۔ جو "عید اور جیلی بیلی" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک گئے ہیں۔ اب انشاءاللہ تیسری چوتھی اور پانچویں جلد بھی عنقریب مارکیٹ میں آ جائیگی۔ لیکن چونکہ جمہوریت کے آنے کی وجہ سے ہمارے وطن میں اخبارات اور رسائل کی تعداد حشرات الارض کی طرح بڑھ گئی ہے اس لئے عید سے پہلے مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ صرف مضامین لکھتے وقت سر کھجا لیا کرتا ہوں۔ جس طرح میں عید کے تقدس اور خوشی سے زیادہ کمانے کی خاطر مضامین لکھتا ہوں اسی طرح ہمارے مالکان اخبار بھی عید کی خوشی سے زیادہ صرف روپیہ کمانے کی خاطر "عید نمبر" نکالتے ہیں۔

عید جیسے جیسے قریب آتی ہے مجھے ملک کے تقریباً سارے اخبارات اور رسائل کی طرف سے آرڈر پہ آرڈر وصول ہوئے ہیں کہ

جناب!

"ہمارا عید نمبر عید کے دن بڑی آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے اس لئے ہم آپ کے مضمون لاجواب کے لئے بے تاب ہیں۔ ہمارے اخبار کے لئے ایسا مضمون لکھئے کہ دوسرے اخبار والے جل بھن کر کباب ہو جائیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ اس مرتبہ "عید اور بیوہ کا شباب" پر مضمون لکھیں اور معاوضے کے علاوہ ثواب بھی کمائیں۔ فی الحال آدھا معاوضہ ارسال خدمت ہے۔ بقیہ آدھا عید کے دن ادا کر دیا جائے گا۔ ویسے

ہمارا آپ کا پچھلا حساب کتاب بالکل صاف ہے یہ واضح رہے کہ آپ ہر سال عید کی خوشی کے موقع پر مضامین کے معاوضے میں دس فی صدی کمی کرتے تھے اس سال کیوں نہیں کی ؟"

فقط آپ کا آفتاب
مدیر اخبار شب تاب

میں دھڑا دھڑ عید پر مضمون لکھتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے عید کا دن بنایا۔ ورنہ اگر اس نے یری میری زندگی میں عید کا دن معین نہ کیا ہوتا تو پھر میں شاید یہ بتا نہیں سکتا کہ ہم پر کیا گزری ہے اولاد پر کیا گزرے گی۔

خیر اب اس کا کیا تردد۔ اب تو عید آئی ہے اور بڑے ٹھاٹھ سے آئی ہے۔

اب تو عید ہمارا بازار ہے تو زندگی گرانڈ عید سیل اس لئے کہتا ہوں کہ مسجد کو نہ دیکھ، مجھے دیکھ اور

عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم
رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

جھوٹ بولو اور حکومت کرو

میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت آدمی سمجھتا ہوں بلکہ آپ سب بھی بڑے
خوش قسمت ہیں کہ میں اور آپ اس زمانہ میں پیدا ہوئے جس پر جھوٹ
کی حکومت ہے اور سچ کو کتا تک نہیں پوچھتا۔ سچ در اصل ہے بھی ایسی
چیز جس کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہئے۔ کیونکہ اس میں فائدہ کوڑی
کا نہیں اور نقصان لاکھوں کا ہے۔ سچ نے دنیا کو از آدم تا ایں دم (یہاں یہ
واضح رہے کہ ایں دم آدم کے بیٹے کا نام نہیں ہے) اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ
آدم اور ابن آدم دونوں کا ناک میں دم آگیا تھا۔ وہ تو کہئے خیر سے جھوٹ
نے دنیا کو پھر سے سنبھال لیا۔ میرا یہ دعوے ہے کہ اگر جھوٹ نے

دنیا کو نہ سنبھالا ہوتا تو سچ کی بدولت دنیا پر کبھی قیامت آجاتی۔

اتنا کچھ عرض کرنے کے بعد مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے جھوٹ کی تعریف میں سچائی سے کام لے رہا ہوں۔ کم بخت یہ سچائی یا سچ —— یہ جو کچھ بھی ہے اس سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہے۔ ہر جگہ پھٹے میں ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ آپ جہاں کہیں بھی کسی پھٹے میں ٹانگ اڑی ہوئی دیکھیں تو بغیر سوچے سمجھے یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ ٹانگ سچ کی ٹانگ ہے۔ میں اگر یہاں جھوٹ بولوں —— (اف پھر وہی سچ)

میں سچ سے جتنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں وہ اتنی ہی شدت سے میرا پیچھا شروع کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ میں جھوٹ کی تعریف میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تو زبان و قلم کے ساتھ سچائی لپٹی ہوئی ہے —— سچ کا کبھی کوئی بھروسہ نہیں حد یہ ہے کہ آج تک اس کی جنس تک کا تعین نہ ہو سکا۔ کبھی وہ مونث ہے تو کبھی مونث —— ؟ سچ ہے تو مذکر اور سچائی ہے تو مونث۔ آپ ہی سچ سچ (پھر سچ) بتائیں کہ اس پر کس طرح بھروسہ کیا جا سکتا ہے اس کے برعکس آپ جھوٹ کو دیکھئے —— ہے نا اپنا ٹھیٹ مذکر —— اور مذکر بھی ایسا کہ موجودہ دور میں ہر انسان کے لئے ایک بڑی دنیا پیدا کرتا ہے۔ سچ اور سچائی نے کیا پیدا کیا —— ؟ پریشانی! مفلسی حتیٰ کہ موت۔

میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ جب بھی میں نے سچ بولا ہے نقصان اٹھایا ہے اور جب بھی جھوٹ بولا فائدہ ہی فائدہ " کمایا ہے (آپ جھوٹ نہ بولئے) آپ بھی جھوٹ بول کر ہمیشہ فائدہ ہی اٹھایا ہے گا۔

آج کل میں صرف جھوٹ بولتا ہوں اور بڑے مزے کی زندگی بسر کرتا ہوں جھوٹ بولنے میں میں نے ایسی مہارت حاصل کی ہے کہ ملک کے مشہور و معروف جھوٹوں میں میرا نمبر پہلا ہے اس میں میں نے ایسی ملک گیر شہرت حاصل کی ہے کہ ملک کے بڑے بڑے جھوٹے جھوٹ بولنے سے پہلے میرا نام لیتے ہیں پھر جھوٹ بولتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں (مبادا کہ آپ اسے جھوٹ سمجھیں) میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔

اس سال پاکستان کے جھوٹوں کا ایک سالانہ انعامی مقابلہ منعقد ہوا۔ جس میں سال رواں کے جھوٹے نمبر ایک کا پہلا انعام جس جھوٹے کو ملا۔ وہ میرا اپنا سگا چھوٹا بھائی ہے۔ اس کو انعام اس جھوٹ پر ملا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ

"میں نے اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کو ایک بار سچ بولتے ہوئے سنا ہے۔"

آپ یہاں یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ہمارا "ہمہ خاندان دروغ باف است۔"

جی ہاں —— آپ نے سچ فرمایا (اور آپ نقصان اٹھائیں گے) لیکن آپ ہی بتائیں کہ اس کے بغیر ہمارا خاندان اتنی ترقی کس طرح کرسکتا تھا۔ یا پھر اس کے بغیر دنیا کس طرح ترقی کرسکتی تھی۔!

جھوٹ کی لذتوں اور فائدوں سے میں نہایت بچپن ہی سے واقف ہوں اور یہ عقدہ پہلی بار بچپن ہی میں مجھ پر کھلا "جھوٹ بولو اور خوش رہو۔" بچپن کے ایک دو واقعے آپ بھی سن لیجئے اور اپنے واقعات سے ان کا

تقابل بھی کیجئے۔

میری عمر شائد کوئی آٹھ دس سال کی تھی۔ مجھے چاکلیٹ کھانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن میں اور میرے چھوٹے بھائی نے اپنے والد کی شیروانی کی جیب سے ایک روپیہ چرایا۔ والد کو اس کا علم ہوا۔ انھوں نے ہم دونوں کو بلا کر پوچھا

بتاؤ تم دونوں نے میری جیب سے روپے چرائے ہیں؟

میرے چھوٹے بھائی نے جو ان دنوں گلستاں بوستاں پڑھ رہا تھا۔ فوراً شیخ سعدی کے چکر میں آگیا اور بولا۔

"ہاں! میں نے آپ کی جیب سے ایک روپیہ چرایا ہے۔

بس پھر کیا تھا۔ والد نے اس کے گال پر ایک زور دار چانٹا رسید کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"میں نے ایسا کوئی بُرا کام نہیں کیا ہے میں کیوں چوری کروں اگر مجھے ضرورت پڑے گی تو آپ سے اسی طرح مانگ لوں گا جس طرح ہمیشہ مانگا کرتا ہوں"

والد صاحب میرے اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ فرمایا "مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے۔ یہ لو تم ایک روپیہ میری طرف سے لے لو۔

دیکھا آپ نے جھوٹ بولنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ یعنی ایک کے دو ملتے ہیں۔

میرے بچپن کے اس واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر اب آپ ساری دنیا پر غور کیجئے کہ میری طرح دنیا کے ان سارے آدمیوں کو جو جھوٹ بولتے ہیں ایک کے دو ملتے ہیں یا نہیں ـــــ؟ اور جو سچ بولتے ہیں وہ بچارے آنکھوں سے چپیڑ پونچھنے بیٹھتے ہیں مثلاً ـــــ مثلاً میرا چھوٹا بھائی جس کا واقعہ آپ نے ابھی ابھی پڑھا ہے اگرچہ وہ واقعہ بھی جھوٹا ہے۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اگر اچھی زندگی بسر کرنی ہے تو پھر یارو جھوٹ بولو۔ جھوٹ سے دنیا ملتی ہے اور سچ سے آخرت ـــــ اب رہی آخرت! ـــــ تو اس کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ع آخرت کی خبر خدا جانے

شاعر کا میں نے یہاں اس لئے ذکر کیا ہے کہ شاعر بھی ـــــ دیکھئے بڑی مشکل پیش آ گئی۔ یہاں یہ کہتے ہوئے مجھے بڑا تکلف بڑی جھجک محسوس ہو رہی ہے کہ شاعر بھی پرلے درجے کے جھوٹے ہوتے ہیں، میں یہاں شاعروں کو جھوٹا کہنے کی گستاخی کا مرتکب تو نہیں ہو سکتا لیکن آپ نے شاعروں کے کلام پڑھے ہوں گے جس میں جب کبھی وہ اپنے معشوق کا ذکر کرتے ہیں تو جھوٹ کا وہ طومار باندھتے کہ شائد جھوٹ کو بھی شرم آنے لگتی ہے۔ مثلاً کل ہی کی بات ہے۔ میں ایک شاعر کا کلام پڑھ رہا تھا تو اس میں کہیں ایک شعر مجھے نظر آ گیا اور یاد بھی رہ گیا محض اس لئے کہ دروغ باف را دروغ باف می شناسد، سنیئے وہ شعر یہ

ہے۔ س

انتہائے لاغری سے جب نہ آیا میں نظر
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیئے

اب آپ ہی (سچ سچ بتائیں) کہ کیا انسان اتنا لاغر بھی ہوجاتا ہے کہ سوئی یا پن یا کیل بن جائے کہ اس کو ڈھونڈنے کے لئے بستر جھاڑنے کی ضرورت پڑے۔

شاعروں کے جھوٹ کو تو چھوڑیئے شاعر تو شاعر ہی ہوتے ہیں ان کو تو ہمیشہ معاف ہی کر دینا چاہیئے (اگر آپ انھیں معاف نہیں کریں گے وہ آپ کو کلام سناتے سناتے کے ناک میں دم لے آئیں گے، شاعروں سے قطع نظر آپ اپنے ہی ملک کے سیاستدانوں اور رہنماؤں کو دیکھئے جنھوں نے جھوٹ بول بول کر قوم اور ملک کو ترقی دی ہے اور کئی مسائل سلجھانے میں ہمہ تن مصروف ہیں ـــــــ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان مسائل کا ذکر کرنا فضول ہے کیونکہ یہ بھی جھوٹے مسائل ہیں۔

لیکن صاحب کمال ہے یعنی جھوٹ کا کمال ہے ابھی چند دنوں کی بات ہے مہاجرین نے اپنی تباہ حال زندگی سے تنگ آکر کچھ سچ سچ باتیں رہنماؤں کو بتا دیں۔ سچ چونکہ کڑوا اور اس کے نتائج بھی کڑوے ہوتے ہیں۔ اس لئے صورتِ حال خطرناک ہوگئی تھی اس لئے رہنماؤں نے فوراً جھوٹ کا سہارا لے لیا۔ انھوں نے مہاجرین کو دلاسا دیا کہ گھبراؤ نہیں ـــــ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ "ہم اسکیم" بنا رہے ہیں۔ اسکیم

کا نام سنتے ہی مہاجرین مطمئن ہو گئے۔ صورت حال خوشگوار ہو گئی۔ رہنماؤں نے آئس کریم کھائی اسکیم وسکیم کچھ نہیں بنائی۔

اب آپ فرمائیں کہ بزرگوں کا وہ محاورہ جھوٹا ہے کہ نہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ رفیقانِ من اگر جھوٹ کے پاؤں نہ ہوتے تو آج جھوٹ اس طرح اس ملک میں کس طرح موجود ہوتا۔ اگر جھوٹ کے پاؤں نہ ہوتے تو جھوٹا واشنگٹن سے لورریا کس طرح پہنچ جاتا۔

یادش بخیر واشنگٹن ——— واشنگٹن مجھے دنیا کا سب سے عظیم شہر معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ شہر نہیں بلکہ جھوٹ کا صدر دفتر ہے میرا تو جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واشنگٹن میں جا بسوں۔ یہاں کیا ہے صرف دریائے راوی ہے اور جسے دیکھو وہ یہی کہتا نظر آتا ہے کہ دروغ بر گردن راوی۔ یہ بھی ایک مضحکہ خیز جھوٹ ہے کہ نہیں ——— بھلا راوی کی گردن کہاں سے آئی کہ آپ جھوٹ اس پر لاد دیں۔

جھوٹ کے پاؤں ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ جھوٹ نہیں ہے کہ بغیر جھوٹ کے آپ اس دنیا میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اگر آپ کا جھوٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر یوں سمجھ لیجئے کہ جھوٹ کے نہیں بلکہ آپ کے پاؤں نہیں ہیں۔

سچ پوچھئے تو جھوٹ دراصل اس دور سرمایہ داری کی روح ہے اس دنیا میں روزگار، کرائے کا مکان، روٹی اور تسخیر محبوب کے لئے صرف ایک ہی موثر تعویذ ہے اور وہ سچ مچ جھوٹ ہے۔ اس دنیا میں

دروغ کو کوئی فروغ ہو یا نہ ہو دروغ باف کو ضرور فروغ حاصل ہوتا ہے
میرا یہ دعوے ہے کہ جب تک دنیا میں دولت چند آدمیوں کے پاس ہے اور لاکھوں، کروڑوں آدمی مفلس ہیں۔ اس وقت دنیا کا سارا کاروبار صرف جھوٹ کے سہارے چل سکتا ہے۔ جھوٹ ہی وہ محور ہے جس پر موجودہ دنیا قائم ہے۔ آپ موجودہ دنیا کی تاریخ مرتب کریں تو آپ کو ہر صفحہ پر یہ لکھا نظر آئے گا کہ۔

جھوٹ بولو اور حکومت کرو۔

یہاں حکومت سے جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ یہ بھی میں نے جھوٹ کہا ہے ورنہ میں تو بڑا وفادار باشندہ ہوں گا۔ صرف یہ جھوٹ نہیں ہے۔ فقط

خواتین و حضرات

صحیح یا غلط

بہرحال یہ میرا خیال ہے کہ جمہوریت نے قوموں اور ملکوں کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا کہ مائیکروفون لاؤڈ اسپیکر اور قدِ آدم آئینے بنانے والے کارخانوں اور انھیں بیچنے یا کرائے پر دینے والی دکانوں کو پہنچایا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض مجھ جیسے "میٹر آف فیکٹ" قسم کے انسان صرف مائیکروفون، لاؤڈ اسپیکروں اور قدِ آدم آئینوں کی تعداد سے اندازہ لگاتے ہیں کہ کون ملک اور کون قوم کتنی زیادہ یا کتنی کم جمہوری ہے۔

آپ مجھ سے اتفاق نہ بھی کریں تو اس حقیقت کا کچھ نہیں بگڑتا کہ موجودہ زمانے میں کوئی ملک تقریروں کے بغیر اور کوئی قوم مقرروں کے بغیر زیادہ دیر تک جی ہی نہیں سکتی - اس زمانے میں حصولِ گندم سے لے کر تسخیر محبوب تک ہر کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے تقریر اور مقرر دونوں کا وجود بہر نوع ضروری ہے -

یہ تو خیر سبھی جانتے ہیں کہ تقریر کسے کہتے ہیں اور مقرر کون ہوتا ہے! لیکن اگر اس دنیا میں اور اس زمانے میں کوئی سادہ لوح اور خوش نصیب انسان ایسا بھی موجود ہے جو ان دونوں کو نہیں جانتا تو صرف اس کے افہام و تفہیم کی خاطر تقریر اور مقرر دونوں کا تعارف کرائے دیتا ہوں -

ایک بات یا چند باتوں کو زیادہ سے زیادہ انسانوں کی بات کو ایک آدمی تک پہنچانے والے ذریعہ کا کیا نام ہے! بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی بات بہت لمبی ہو جائے تو وہ تقریر ہے —— یا پھر خود بولتے رہنے اور سینکڑوں انسانوں کو تھوڑی دیر کے لئے گونگا بنا دینے یا سلا دینے کا نام بھی تقریر ہے -

اب رہا مقرر —— اس کی پہلی تعریف تو یہ ہے کہ مقرر وہ ہوتا ہے جو تقریر کرتا ہے - لیکن یہ ایک بہت سادہ سی تعریف ہے جو سب کی سمجھ میں باآسانی آجاتی ہے - میں دراصل وہ تعریف پیش کرنا چاہتا ہوں جو اتنی آسانی سے سب کی سمجھ میں نہ آسکے - کیوں کہ یہ زمانہ وہ ہے جس میں اگر کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے جو سب کی سمجھ میں آسانی سے

آجاتی ہے تو لوگ ایسی بات کہنے والے کو بیوقوف سمجھتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ اس لئے میرے خیال میں ہر وہ شخص جو ایک بڑے مجمع میں کھڑا چیخ چیخ کر بس اپنی کہے جا رہا ہے اور سنتا کسی کی نہیں۔ یا اگر سنتا بھی ہے تو صرف زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے —— بلا شبہ وہ مقرر ہے۔ مقرر میں اور عام آدمی میں فرق ہوتا ہے تو صرف اتنا کہ عام آدمی سفید بینگن کو انڈا کہتا ہے تو صرف ایک بار غلطی سے کہہ دیتا ہے لیکن جو شخص اسی سفید بینگن کو جان بوجھ کر بار بار انڈا کہتا ہے اور بھرے مجمع میں اسے انڈا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو آپ کو بغیر جھجک کے یہ مان لینا چاہیئے کہ وہ شخص مقرر ہے —— مقرر کو پہچاننے کی دو ایک خصوصیات اور بھی ہیں۔ یعنی جو شخص کسی جلسۂ عام سے پہلے سوڈا واٹر کی بوتل پیتا ہے اور جلسۂ عام کے بعد اس شخص کے سر پر سوڈا واٹر کی بوتل ٹوٹتی ہے۔ یا پھر جو شخص چند آدمیوں کے ہاتھوں گندے انڈے اور سڑے ٹماٹر کھاتا ہے اور تقریر کے بعد لوہے کی ہتھکڑیاں پہنتا ہے وہ سوائے مقرر کے اور کوئی نہیں ہے

اگر ہم کسی جمہوری ملک کے باشندے ہیں تو پھر ہم مقرر سے اور تقریر دں سے ایک دن کے لئے بھی چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ جب تک آپ گھر پر رہتے ہیں آپ کے کوئی نہ کوئی بزرگ آپ کے سامنے ناصحانہ تقریر فرماتے رہتے ہیں۔ کہ یہ نہ کرو، وہ کرو، سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو۔ شادی کرو، رومانس نہ لڑاؤ، پان کھاؤ۔ سگریٹ نہ پھونکو، لسی پیو۔ شراب نہ پیو، نیکی کرو۔ اور دریا

میں نہ ڈالو وغیرہ وغیرہ - آپ اس تقریر سے تنگ آکر گھر سے باہر نکل کر فٹ پاتھ پر آجاتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دور بھی نہیں جاتے ہیں کہ لوگوں کے ہجوم سے فٹ پاتھ جام ہوا ہوا" نظر آتا ہے۔ اور آپ کے کانوں سے ایک تقریر ٹکرانے لگتی ہے

"بھائیو اور بزرگو!

رات بھر زلفوں کے لئے سر مروڑا سانپ کا
کیا ہی کنڈل مار کر بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا

میں نہ کوئی اشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر۔ بلکہ میں تو ایک کلرک ہوں جس کے بارے میں شاعر نے کیا خوب شعر کہا ہے۔

کلرک رازِ دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے
نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گل بیکار ہوتا ہے

اسی لئے صاحبان میں اپنا رازِ دلی نہیں کہوں گا۔ صرف یہ کہوں گا کہ یہ دوائی جو میں آپ کو بیچ رہا ہوں وہ میں نے خود استعمال کی ہے .... اور ...

ابھی فٹ پاتھ کے اس مقرر کی تقریر آپ کے کانوں میں گونج رہی ہے اور اب آپ ایک تھیٹر ہال کے سامنے سے گزر رہے ہیں تو دوسری تقریر اس تقریر میں مدغم ہو جاتی ہے۔ تھیٹر ہال کے سامنے میز پر کھڑا ہوا ایک ہونق قسم کا انسان رنگ برنگے چیتھڑوں سے سلا ہوا بدوضع سوٹ پہنے اپنی مصنوعی رنگین داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر چلاّ رہا ہے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین"!

"آیئے آیئے —— ادھر تشریف لائیے بلبل بغداد سے ملئے۔ الف لیلیٰ کی حسینہ کی زیارت کیجئے۔ مس بدر منیر سے ملئے —— آہاہا مس بدر منیر جب ناچتی ہے تو ساری دنیا کو نچاتی ہے۔ جب چلتی ہے تو ہرن چوکڑی اور مور ناچنا بھول جاتا ہے۔ اور کیک دری خجل ہو جاتا ہے۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ تیری ٹھمک ٹھمک چال —— ہو رانی۔ تیرے گھنگریالے بال —— ہو رانی"۔

آپ لاحول پڑھتے ہوئے اپنے دفتر میں جاتے ہیں۔ کوٹ اتا[ر] نکٹائی ڈھیلی کر اور آستین چڑھا اپنا کام شروع کرنا ہی چاہتے ہیں کہ پھر آ[پ] کے کان بجنے لگتے ہیں:

خواتین وحضرات!

آج رات کو آٹھ بجے گول باغ میں لسان القوم زبان الملک، علامہ ابراہیم حلبیس صاحب "جمہوریت اور آزادیٔ تقریر" کے موضوع پر تقریر فرمائیں گے۔ پردہ سائیکل اسٹینڈ، لیمن، پان، سگریٹ۔ چائے۔ اور جیب کتروں کا خاص انتظام ہے، آج رات کے آٹھ بجے ......"

رات کو آٹھ بجے آپ چاہے اس جلسے میں شرکت نہ کریں۔ لیکن مقرر تب بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ آپ اپنے گھر میں بستر پر لیٹے سونے کی کوشش میں کروٹیں بدل رہے ہیں۔ آپ کے کان بھنبھا رہے ہیں۔

برادران اسلام!

یہ وقت سونے کا نہیں (حالانکہ اس وقت رات کا ایک بجا ہوتا ہے) کیا آپ نے نہیں سنا کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ اُٹھ جاگ اے خوابیدہ مسلم اٹھ اور سُن کہ حکیم الامت کیا فرما رہے ہیں؟

از خواب گراں خواب گراں، خواب گراں خیز!

اب آپ کی کیا مجال ہے جو سو سکیں۔ ناچار آپ جمائیاں لیتے کھٹمل مارتے، مچھر جھلاتے اور تقریر سنتے تارے گنتے رہتے ہیں۔ دوسرے دن آپ تنگ آ کر شہر چھوڑ کر دوسرے شہر میں جانے کے ریل میں سوار ہو جاتے ہیں۔ تو ساتھ ہی مقرر یہ کہتا ہوا ڈبے میں سوار ہوتا ہے۔

"اجی صاحب! جہاں جائیے گا۔ ہمیں پائیے گا۔ اور پھر تقریر شروع کر دیتا ہے

"اے مسافر گاڑی والو!

دنیا مسافر خانہ ہے اس مسافر خانے میں ایسے مسافر

بچے بھی ہیں جو یتیم ہیں۔ اس لئے ہماری انجمن نے ایک
یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔ تاکہ یتیموں کی پرورش ہو یا نہ ہو
ہمارے بچے کہیں یتیم نہ ہو جائیں۔ آپ اہلِ درد ہیں۔
صاحب اولاد ہیں۔ یتیموں کی نہیں تو کم از کم ہماری مدد فرمایئے
نکالئے جو کچھ آپ کو خدا نے دیا ہے۔ روپیہ، دو روپیہ
پچاس روپیہ، سو روپیہ۔ کیونکہ شاعر نے کہا ہے۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر

آپ بتایئے آپ کیا کریں گے؟ کس شہر میں جائیں گے۔ اگر آپ
جمہوری ملک کے باشندے ہیں تو مقرر کہیں آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گا
قہر مجبور برجان مجبور، برداشت کئے جایئے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی آپ کا زمانہ
بھی آئے۔ ویسے مقرروں سے اپنا انتقام حسب استطاعت جاری
رکھئے۔ جس طرح ایک تیل مالش والے نے ایک مقرر سے اپنا انتقام
لیا تھا۔ کیا آپ نے مقرر اور تیل مالش والے کا قصہ نہیں سنا۔
لیجئے وہ بھی سن لیجئے۔

کراچی کے جہانگیر پارک میں ایک جلسۂ عام ہو رہا تھا جس میں ملک
کے ایک مشہور رہنما بڑی جوشیلی تقریر فرما رہے تھے۔ ایک جگہ مسلمانوں
کی حالت زار کا دردناک منظر دکھاتے ہوئے انھوں نے مسلمانان پاکستان
کو غیرت دلائی۔

پاکستان کے مسلمانوں!
آج سارے عالم اسلام پر مصیبتوں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں پر ہر جگہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔
دیکھو آج مصر میں کیا ہو رہا ہے۔ ایران میں کیا ہو رہا ہے تیونس اور مراکش میں کیا ہو رہا ہے۔ افغانستان اور ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ خود پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ ہر جگہ مسلمانوں کی عزت وقار اور زندگی خطرے میں ہے۔ اس لئے جلتے ہو مسلمانو۔ اس نازک وقت پر تمھیں کیا کرنا چاہیئے؟
مقرر صاحب جواب کے لئے ایک لمحے کو رُکے ہی تھے کہ مالشئے نے آواز لگائی۔
"تیل مالش"
اس آواز پر مسلمان بہنیں اور بھائی ٹھٹھے مار کر ہنس پڑے اور منتظمین نے مالشئے کو دھکے دے کر جلسے سے باہر نکال دیا
مالشئے کے اس خطرناک انجام سے قطع نظر میں ضرور جانتا ہوں کہ تقریریں کسی قوم کی قسمت بدل دیتی ہیں مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ پاکستان اور ہندستان سے انگریز کو نکالنے اور بھگانے میں مولانا محمد علی، قائد اعظم، گاندھی جی، بہادر یار جنگ، ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو، خان عبدالغفار خاں، ڈاکٹر اشرف، سجاد ظہیر، عطاء اللہ شاہ بخاری۔ ابوالاعلیٰ مودودی عنایت اللہ مشرقی۔ مرزا ابراہیم۔ مخدوم محی الدین اور راقم الحروف ابن جلیس

کی آتشیں تقریروں کا عظیم الشان کارنامہ ہے لیکن میرے پیش نظر اس وقت ایسے مقرر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مقرر ہیں جو ملک اور قوم کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اپنی ذات کو فائدہ پہنچا لیتے ہیں۔ اگر وہ ہمارا اور آپ کا کوئی بڑا نقصان نہیں کرتے تو کم از کم آپ کو "بور" ضرور کرتے ہیں۔ اب آپ ہی ایمانداری سے یہ بتائیے کہ ہم دنیا میں بور ہونے کے لئے تو نہیں آئے ہیں

یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں اکیلا ہی نہیں بلکہ ہر شخص تقریروں اور مقرروں سے بڑا عاجز آچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جلسہ ہائے عام میں جہاں مقررین جگانے والی تقریریں کرتے رہتے ہیں۔ وہاں سننے والے بالعموم سوتے رہتے ہیں۔ مقرر ہی مقرر کی تقریر سنتے ہوں۔ تو یہ دوسری بات ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ میں جانتا ہوں۔ اور چونکہ برسبیل تذکرہ واقعات سنانے کی رسم بڑی پرانی ہے۔ اور میں سرگشتہ رسوم و قیود ہوں۔ اس لئے وہ واقعہ بھی سنا دیتا ہوں۔

ایک جلسۂ عام میں ایک مقرر ایسی بور اور لمبی تقریر کر رہا تھا کہ لوگ بیزار ہو کر اُٹھ اُٹھ کر جانے لگے۔ جب سب لوگ چلے گئے۔ صرف ایک آدمی باقی رہ گیا۔ تو مقرر نے اس آدمی سے کہا:۔

"میں آپ کا بڑا مشکور ہوں کہ آپ کو میری تقریر بڑی پسند آئی۔ اور آپ نے میری پوری تقریر سننے کی زحمت گوارا فرمائی۔ آئیے میں آپ کو چائے پلا دوں۔"

اس آدمی نے ناک بھنوئیں چڑھا کر جواب دیا۔ حضرت

میں چاہئے تو ضرور دیوں گا۔ لیکن عرض کرنا یہ ہے کہ میں
نے اس لئے آپ کی تقریر سننے کی زحمت گوارا کی ہے کہ پروگرام
کے مطابق آپ کے بعد مجھے تقریر کرنی تھی۔"

ایک زمانے میں یعنی لڑکپن کے زمانے میں مجھے تقریریں کرنے کا بڑا
شوق تھا۔ اسکول اور کالج کے اسٹیج پر تقریریں جھاڑتے جھاڑتے میں سچ
سچ ایک مقرر بن گیا تھا۔ ہر مقرر کی طرح میں نے بھی ایک قد آدم آئینہ خرید لیا
تھا جس کے سامنے ہر صبح آدھ گھنٹے تک تقریر کی مشق کرتا تھا۔ لیکن جب
مجھے یہ معلوم ہوا۔ کہ اس ملک میں ہر مقرر بالآخر لیڈر بن جاتا ہے تو
میں لرز اُٹھا۔ کانپ اُٹھا۔ بے تحاشا ڈر گیا۔ فوراً کان پکڑے۔ توبہ کی،
اور وہ قد آدم آئینہ اپنے دوست یعسوب الحسن کے ورزشی اکھاڑے کو
بطور تحفہ دے دیا۔ جہاں اب نوعمر پہلوان اس آئینے کے سامنے کھڑے
اپنے جسم کے "مسل" بناتے ہیں۔ یوں بھی آج کل قوم کو مقرروں سے
زیادہ پہلوانوں کی اور لچھے دار الفاظ سے زیادہ مضبوط "مسلس" کی
بڑی ضرورت ہے۔

میں اس بات کو قطعاً ناپسند کرتا ہوں۔ کہ ہر مقرر لیڈر بن جائے
یہ بدعت سارے ملک میں ہے۔ جہاں کسی کو اچھا بولنا آ گیا بس وہ خود
کو لیڈر سمجھنے لگا۔ لیڈر سیاستدان ہوتا ہے۔ اور مقرر بیشتر جذباتی ہوتا
ہے ——— مثلاً مجھے دیکھئے اگر آپ نے کبھی میری دھواں دھار تقریر
سُنی ہے تو یقیناً آپ میری جادو بیانی کے بھی معترف ہوں گے۔ لیکن

جب میرے لیڈر بننے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ تو لوگوں نے کہا — میاں پہلے منھ دھو آؤ۔ چنانچہ میں لوگوں کا مشکور ہوں کہ لیڈر بنانے کے بجائے انھوں نے مجھے منھ دھونے بھیجا۔

چلئے۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ بدعت بھی گوارا ہے۔ لیکن یہ تو میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ہر بڑے آدمی اور اعلیٰ افسر کو بہترین مقرر تسلیم کر لیا جائے۔ آپ گرد و پیش دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا۔ کہ یہ حماقت بھی پورے شباب پر ہے جب کبھی کسی جلسۂ عام کے بارے میں مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں جلسے میں فلاں وزیر، فلاں رئیس اعظم، فلاں ڈپٹی کمشنر اور فلاں تھانیدار تقریریں فرمائینگے تو خدا کی قسم جی چاہتا ہے کہ میں بھی ایک جلسۂ عام بلاؤں۔ اور خود بھی ایک تقریر کروں جس میں فن تقریر اور ڈپٹی کمشنری، ایرانی تیل کا مسئلہ اور رئیس اعظم امیر محمد خاں کی فارسی تقریر نہر سوئیز اور مسئلہ سوڈان تھانیدار معراج الدین کی نظر میں وغیرہ وغیرہ پر خوب روشنی ڈالوں

اچھا آخر میں سنئے

خواتین و حضرات! میں آج رات تقریر کے مقصد اور مقرر کے فرائض پر ایک عالمانہ اور پر مغز تقریر کرنے والا ہوں۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ آپ ٹھیک آٹھ بجے گول باغ میں تشریف لائیں۔ آپ بے شک اپنی خواتین کو بے پردہ اور سائیکلوں کو بغیر تالے لے آئیے۔ وہاں پردہ اور سائیکل اسٹینڈ کا معقول انتظام ہو گا۔ انشاء اللہ گھبرانے کی

کوئی بات نہیں اور ہاں یاد رکھیے۔ پھولوں کے ہار۔ گندے انڈے اور سڑے ٹماٹر ضرور ساتھ لیتے آئیے۔

پھر ایک بار یاد رکھیے۔ آج رات کو گول باغ میں ٹھیک آٹھ بجے......

پھرتے تھے میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہ تھا

کہا جاتا ہے کہ اُردو شاعری کے باوا آدم حضرت میر تقی میر کو اس جہانِ فانی سے کوچ کیے ہوئے سالہا سال گزر چکے ہیں۔ لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے میر تقی میرؔ ابھی تک اس دنیا میں موجود ہیں اور اس وقت تک موجود رہیں گے۔ جب تک میں یا اردو کا کوئی شاعر یا ادیب موجود ہے

میرجی سے میری ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ صرف یہی کوئی تین سال پہلے جب میں ملک کفرستان سے ہجرت کر کے ملک نورستان

چلا آیا تو سب سے پہلے جو بزرگ مجھے ملے وہ حضرت میر تقی میر تھے۔
پہلی ملاقات ہی میں ؎

تو من شدی من تو شدم   تو جاں شدی من تن شدم

والا حادثہ پیش آگیا، اور اب یہ حال ہے کہ میرا اور ان کا چوبیس گھنٹوں کا ساتھ ہے۔ ہم ایک دوسرے میں کچھ اس طرح مدغم ہو چکے ہیں کہ ایک پل کے لئے بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ مجھے تو اکثر و بیشتر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں میں نہیں ہوں بلکہ خود میر تقی میر ہوں، شاید میر جی بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہوں

ملاقات کے روز اول ہی سے میر جی میرے ساتھ "خواجہ غریب نواز ہوٹل" نزد جونا مارکیٹ کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہنے لگے ہیں۔ میر جی کے ساتھ کل پندرہ چھوٹے بڑے افراد خاندان ہیں جن کی پرورش میر جی کے ذمے ہے۔ اس طرح ان کا روزانہ کا خرچ تقریباً پندرہ سے بیس روپے ہے، لیکن آمدنی.... ....! آمدنی جیسے میر جی کا معشوق جفا پیشہ ہے جس کا وعدہ وفا ہوا تو ہوا، نہیں ہوا تو نہیں ہوا۔

سالہا سال تک شاعری کر لینے اور زار و قطار رونے سے تنگ آکر میری جی نے اب اردو ادب کے دوسرے اصناف افسانہ نگاری، مضمون نگاری، ناول نگاری اور رپورتاژ نگاری شروع کی ہے، کیونکہ شاعری کے مقابلے میں نثر کے زیادہ دام اٹھتے ہیں۔ میر جی نے دیکھتے دیکھتے افسانوں مضامین اور رپورتاژ کی تقریباً ایک درجن کتابیں تحریر کر ڈالیں، جن کی آمدنی

سے ایک ناشر نے کار خریدی، دوسرے نے کوٹھی بنوائی، تیسرے نے دوسری شادی کی، لیکن میرجی جیسے کسی شادیٔ مرگ کا انتظار کر رہے ہیں۔

میرجی کو کون نہیں جانتا ——! آپ نہیں جانتے، یا میں نہیں جانتا نہ صرف اس ملکِ نورستان کا بچہ بچہ جانتا ہے بلکہ وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک بھی ہیں۔ ان کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کئی غیر ملکی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ابھی حال ہی میں میرجی کو حکومتِ پنگ پانگ نے دعوت دی تھی۔ میرجی وہاں بڑے ٹھسے سے گئے، ہوائی جہاز میں اڑ گئے وہاں رہے تو بڑے کر و فر سے رہے، ملک پنگ پانگ کی حکومت اور عوام نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور پھر سڑکیں ناپنے کے لئے بولش مارکٹ پر چھوڑ دیا پچھلے سال ایک اور دور دراز ملک، ملک طوس نے بھی میرجی کو اپنے ہاں دعوت دی تھی لیکن چونکہ میرجی کے ملکِ نورستان اور طوس کی حکومتوں کے درمیان بڑے خوشگوار اختلافات ہیں، اس لئے میرجی کفِ افسوس مل کر رہ گئے۔

آج کل میرجی لکھتے کم اور کفِ افسوس زیادہ ملتے ہیں۔ اب تو میرجی کا دنیا اور انسان کے بارے میں صرف یہ نقطہ نظر ہے کہ انسان دنیا میں صرف کفِ افسوس ملنے کے لئے آتا ہے۔

میرجی سالہا سال سے صرف دو نعمتوں کی تلاش میں ہیں۔ ایک نعمت تو روزگار ہے، دوسری نعمت مکان —— مجھے اکثر و بیشتر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ میرجی جیسا نامور بلکہ عالمگیر شہرت رکھنے والا انسان اس طرح اپنے وطن میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے اور اس طرح پیسے پیسے کے لئے ترستا

ہے، یہ بات بھی نہیں ہے کہ میرؔ صاحب ان کی تلاش نہ کرتے ہوں۔ بلکہ میں چونکہ ۲۴ گھنٹے ان کے ساتھ گھومتا پھرتا ہوں، اس لئے پوری ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میر صاحب اس جان کا دمی سے خدا کو ڈھونڈتے تو خدا کو پا لیتے، یا قبر کی تلاش کرتے تو کبھی کے درگور ہو گئے ہوتے ــــ میرجی نے جب سے شاعری چھوڑی ہے اور نثر نگاری شروع کی ہے اس وقت سے انھوں نے پرانی عادتیں بھی چھوڑ دی ہیں۔ یعنی "گلی میں اس کی گئے سو گئے نہ بولے پھر" والی حرکتوں سے مدت ہوئی باز آ چکے ہیں۔ اب کسی کو اس بات کا گلہ نہیں کہ ہم میر میر کر اس کو بہت پکار آئے۔ اب کوئی میرؔ کے بجائے "می" بھی پکارتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں۔ تو کہنے کا مطلب ہے کہ میرجی اب پہلے کی طرح میر جگر سوختہ نہیں بلکہ بڑی عملی میرین گئے ہیں۔

صبح ہوتے ہی وہ کان پر قلم رکھ کر روزگار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ شام تک مارے مارے پھرتے ہیں۔ آدھی رات تک جانے کیا لکھتے رہتے ہیں، اور آدھی رات کے بعد اس قدر زور زور سے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیتے ہیں کہ اکثر اوقات انھیں مجھے ڈانٹنا پڑا ہے کہ

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

میرجی اور ان کی بیوی میں روزانہ روز کی چخ چخ رہتی ہے۔ ان کی بیوی کہتی ہیں کہ اب چھوڑو یہ پاگل پن۔ سرکار کی نوکری کر لو۔ میر صاحب کو اس مشورے سے طیش آجاتا ہے وہ گرجتے ہیں۔

کیا کہا ــــ سرکار کی نوکری کروں، اس سرکار کی نوکری کروں جس نے بغیر کسی وجہ کے صرف ایک وزیر کی ذاتی دشمنی کے باعث مجھے جیل میں جھونک دیا تھا، اس سرکار کی جو قصیدے لکھوانا چاہتی ہے، اس سرکار کی جو غریبوں کا گلا گھونٹتی ہے، اس سرکار کی جو انسان کی دشمن جاں ہے ــ اس سرکار کی جو ادب کم اور خوشامد زیادہ سمجھتی ہے۔ جس دن میں ایسی جابل سرکار کے آستانے میں داخل ہوں گا تو سمجھ لو کہ وہ میں نہیں ہوں گا بلکہ میری لاش ہو گی۔

میرجی کی بیوی لاش کے لفظ پر بڑی جز بز ہو جاتی ہیں اور سر کے بال نوچ نوچ کر پکارنے لگتی ہیں کہ ہے ہے۔

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لو

میرجی چونکہ اپنے ملک کے غریبوں اور مظلوم انسانوں کے بارے میں کہانیاں، ناول اور رپورتاژ لکھتے ہیں اس لئے حکومت نورستان نے انھیں امن کے زمانے میں ترقی پسند اور ہلڑ ہنگامے کے دور میں کمیونسٹ سمجھتی ہے اور شاید اسی لئے میرجی کا نام حکومت نورستان کی کالی فہرست میں درج ہے۔ اس کالی فہرست میں شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ملک نورستان میں میرجی کا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔ یوں بر سبیل تذکرہ یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ حکومت نورستان نے اپنے قیام سے اب تک جو واحد کارنامہ پیش کیا ہے۔ وہ اپنی رعایا کا حقہ پانی بند کرنا ہے۔

جہاں تک میں میرجی کے بارے میں جانتا ہوں میرجی نہ تو ترقی پسند

ہیں اور نہ کمیونسٹ۔ وہ ترقی پسندی اور کمیونزم کی الف۔ ب بھی نہیں جانتے البتہ وہ ایک دیانتدار اور انسان دوست ہیں۔ لیکن ڈر ہے کہ حکومت نورستان اگر اپنی "عقلمندیوں" کو اسی طرح جاری وساری رکھے تو وہ دن دور نہیں جب کہ میرجی سچ مچ ایک زبردست ترقی پسند اور ایک اسٹالن کمیونسٹ بن جائیں گے۔ میرجی فرماتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نورستان کو کمیونسٹ ممالک سے زبردست مالی امداد ملتی ہے۔ جبھی تو وہ بڑی تیزی سے اپنے ملک کے ہر باشندے کو کمیونسٹ بناتی جا رہی ہے۔

میر صاحب نے حکومت نورستان کی غلامی کے خیال کو اسی طرح دل سے نکال پھینکا ہے جس طرح کھٹمل کو چارپائی سے کبھی کبھی فرماتے ہیں کہ بھئی فرض کرو اگر میں حکومت نورستان کی غلامی قبول کر لوں تو کیا کل لوگ مجھے یہ طعنہ نہیں دیں گے کہ

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

آج کل میر صاحب کسی خالص غیر سرکاری ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ پہلے پہلے تو وہ اخباروں اور رسالوں کے دفاتر کے چکر کاٹتے رہے۔ جہاں ان کی بڑی عزت اور آؤ بھگت تھی، لیکن جہاں وہ یہ پوچھتے کہ "جناب من آپ کے پاس میرے لائق کوئی کام یا روزگار ہے تو مالکان اخبار و رسائل بڑے سٹ پٹا جاتے اور جھینپ کر فرماتے

"حضور میر صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں، آپ ایسی عظیم المرتبت

شخصیت اور ہم آپ کو روزگار دیں!

اس مذاق سے تو بہتر یہ ہے کہ آپ ہمیں چار جوتے لگائیں۔

میرجی نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ہر اخبار اور رسالے کے دفتر میں یہی جملہ سُنا، اور آج کل یہ پروگرام بنا رہے ہیں کہ سچ مچ اس مذاق سے بہتر تو یہی ہے کہ چار چار جوتے ہی لگا آئیں۔

اخبارات اور رسائل اور دیگر ادبی۔علمی اداروں سے مایوس ہو کر میرجی نے یہ طے کیا کہ تجارتی کمپنیوں اور دکانوں میں نوکری تلاش کی جائے کیونکہ وہاں میرجی کی "عظیم المرتبت شخصیت" سے کوئی واقف نہیں ہے۔چنانچہ میرجی سب سے پہلے ایک ہوائی جہاز کمپنی میں گئے جہاں بحوالہ اشتہار و اخبار ایک آسامی خالی تھی۔ میرجی کمپنی کے منیجر کے پاس حاضر ہوئے۔منیجر انگریز تھا۔ پوچھا:-

"ویل میر ٹکی میر ٹم ٹائیپ کرنا جانتا؟"

"نہیں جانتا۔"

"اکاؤنٹنسی جانٹا؟"

"نہیں جانتا۔"

"بک کیپنگ جانتا؟"

"نہیں جانتا۔"

"ٹو فرا دھر کیوں آیا؟"

"تعزیت کرنے آیا!"

"تو فرِگارڈن میں تفریح کر لو۔"

اس کے بعد میرجی نے کئی امپورٹ ایکسپورٹ کے دفتروں اور دوسری کئی تجارتی کمپنیوں میں انٹرویو دیئے۔ آخر میں انھیں ہر جگہ گارڈن کا راستہ دکھادیا گیا۔

میرجی گارڈن میں گئے تو وہاں اتفاقاً ان کا ایک مداح اور معتقد ملا۔ بولا ——— حضور میرصاحب! میں تو آپ ہی کی تلاش میں تھا۔ آئیے چلیے میرصاحب نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ بھئی کہاں لے جارہے ہو۔ چپ چاپ اس کے ساتھ چلتے رہے۔ وہ میرصاحب کو ایک فلم کمپنی کے دفتر میں لے گیا۔ فلم ساز نے بڑی آؤ بھگت کی۔ اور ایک فلمی کہانی لکھنے کی دعوت دی۔ مبلغ پانچ ہزار سکہ رائج الوقت میں معاہدہ قرار پایا۔ میرصاحب نے فلمی کہانی لکھنی شروع کی۔ دو مہینے کی محنتِ شاقہ کے بعد انھوں نے کہانی مکمل کی اور شاداں و فرحاں فلم ساز کے پاس گئے فلم ساز بڑا خوش ہوا اور بولا۔

" لیکن اس وقت تو دو بجے ہیں۔ اب تو بنک بند ہیں۔ آپ کل روپے لے لیجیے۔"

میرجی نے کہا۔

زندگی بھر روپوں کا انتظار کرتا رہا ہوں تو کیا اور چوبیس گھنٹے نہیں کرسکتا۔ ضرور کرسکتا ہوں۔ اچھا! کوئی بات نہیں۔"

اس اثنا میں "فلم سازہ" اٹھلاتی ہوئی اندر سے آئی اور فلم ساز سے

بولی۔

"پیارے میں ذرا شاپنگ کے لئے جارہی ہوں، کیا تمہارے پاس دس روپے ہیں ——؟

فلم ساز نے جیب ٹٹولی اور میرجی سے مخاطب ہوکر بولا

"میرجی آپ کے پاس کھلے دس روپے ہیں۔ کل مجھ سے لے لیجئے گا۔ پانچ ہزار دس روپے!"

میرجی کے پاس اتفاق سے اس وقت دس روپے تھے۔ میرجی نے فلم ساز سے زیادہ فلم سازہ کو مرعوب کرنے کے لئے فوراً دس روپے نکال کر پیش کر دیئے۔ اور گھر لوٹ آئے۔ بیوی کو پانچ ہزار دس روپے کا مژدۂ جانفزا سنایا۔ اور میاں بیوی رات بڑی دیر تک جاگ کر یہ پروگرام بناتے رہے کہ دو ہزار روپے کی پگڑی دے کر وکٹوریہ روڈ پر ایک فلیٹ لیں گے۔ ایک ہزار روپے کا اعلیٰ فرنیچر خریدیں گے۔ ایک ہزار روپے بیوی بچوں کے کپڑوں پر خرچ کریں گے۔ آخری ایک ہزار دس روپوں کے خرچ پر میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا رہا۔ میاں صاحب کہتے تھے کہ ایک ہزار روپے میں کوئی کار خریدلی جائے گی۔ بیوی کہتیں بقیہ نہیں یہ بینک میں جمع کرایا جائے تاکہ مصیبت کے زمانے میں کام آئے۔ لیکن میرجی کہتے تھے کہ تم میرے قلم قوت سے واقف نہیں ہو۔ اب مصیبت کبھی نہیں آسکتی۔ میں ایک اور فلمی کہانی لکھوں گا۔ اور مزید پانچ ہزار —— بس اب ہر مہینے دو مہینے پانچ ہزار تمھیں دے دیا کروں گا۔

صبح ہوئی۔ میرجی بڑے خوش خوش گھر سے نکلے۔ راستے میں پنواڑی سے سگریٹوں کا ایک ڈبہ ادھار لیا، اس کو مژدۂ جانفزا سنایا کہ واپسی میں ان کی جیب میں پانچہزار دس روپے ہوں گے۔ ٹیکسی کار منگوائی۔ اور اس کو پہلے ہی بتادیا کہ کرایہ واپسی میں دیا جائے گا۔ کیونکہ واپسی میں بنک سے پانچ ہزار دس روپے کیش کرانے ہیں۔ ایک دھڑکتا دل لئے میرجی فلم کمپنی کے دفتر پر پہنچے تو حیران رہ گئے کہ وہاں دہلی کا کوئی مہاجر خاندان آدھے مکان میں جھاڑو دے رہا ہے، اور آدھے مکان میں سامان قرینے سے جما رہا ہے۔

میرجی نے پوچھا

"بھائی یہاں تو فلم کمپنی کا دفتر تھا۔ تم نے کوئی اسٹڈیو سمجھ رکھا ہے کہ سیٹ بنانے لگے ہو۔ یا شوٹنگ کرنا چاہتے ہو۔ بھائی وہ فلم ساز کہاں ہیں ؟"

ایک شخص بولا" اجی وہ تو کل رات فرار ہو گئے۔ بہت لوگوں کا روپیہ دینا تھا۔ یہ مکان تو پولیس نے ہمیں دلایا ہے۔ پولیس ابھی ابھی اس فلم کمپنی کا بورڈ اتار کرلے گئی ہے ۔"

میرجی نے سر نہیں پیٹا۔ صرف ٹیکسی ڈرائیور کی طرف دیکھا اور بولے۔ بھائی سن لیا تم نے —— میرے پاس اس وقت ایک پیسہ نہیں یہ فاؤنٹین پن ہے جس کی قیمت چالیس پچاس روپیہ سے کم نہیں۔ یہ قبول کرو میں اب دراصل اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔ یہی دراصل میری تباہی کا

باعث ہے؟
ٹیکسی ڈرائیور نے فاؤنٹین پن جیب میں رکھا اور بولا "آئیے چلئے، آپ کو واپس بھی چھوڑ دوں"۔

اس کے بعد دوسرے دن ملک کے سارے اخباروں نے کالے چوکھٹوں میں بڑی بڑی سرخیوں میں میرجی کی وفاتِ حسرت آیات کی خبریں شائع کیں۔ مضامین اور کتابیں طبع کروائیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں ان کے تعزیتی جلسے کیے گئے اور ہر سال "یومِ میر تقی میر" منایا جاتا ہے۔ حکومتِ ذرستان اس یوم پر کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے گھر گھر میں میر تقی میر کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں ہیں۔ ملک میں جو "میر اکیڈمی" قائم کی گئی ہے، اس کے عہدہ داروں کو ہزاروں روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔

اب ایک راز کی بات سنئے۔ میرجی نے اپنی وفاتِ حسرت آیات کی خبریں اپنی آنکھوں سے پڑھیں۔ وہ اپنے ایک تعزیتی جلسے میں بھی شریک ہوئے ہر سال پابندی سے یومِ میر تقی میر میں شریک ہوتے ہیں۔ اپنے ادب اور فن کی تعریف میں مقالے، مضامین اور نظمیں بڑے شوق سے سنتے ہیں۔

میرجی دراصل مرے نہیں بلکہ انھوں نے میری معرفت اپنے مرنے کی خبر مشتہر کردی، کیونکہ سالہا سال کے تجربے نے ان پر یہ حقیقت منکشف کردی تھی کہ دنیا کو میر تقی میر کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ "کلیاتِ میر" کی اور پھر زمانے نے انھیں یہ بھی سکھایا تھا کہ اگر ادیب شاعر یا فن کار ہو تو دنیا میں زندہ بشکل مردہ رہو ورنہ پھر زندہ درگور ہو گے۔

ان دنوں میرجی کی بیوی کو ان کی تصانیف کی ہر مہینہ بڑی گرانقدر رائیلٹی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ میرجی نے اپنا نام اور شخصیت بدل کر خواجہ غریب تقی از ہوٹل خرید لیا ہے۔ اور اب وہ ہوٹل چلاتے ہیں۔

اب کوئی بھی انھیں غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے ان کی بود و باش نہیں پوچھتا۔ بلکہ ہر سال "یوم میر تقی" کے موقع پر کارکنانِ میر اکیڈیمی ان سے چندہ وصول کرنے بڑی پابندی سے آتے ہیں۔

آج سارا ملک میر صاحب کے لئے روتا ہے اور میر صاحب سارے ملک پر ہنستے ہیں۔ چنانچہ اسی سال "یوم میر تقی میر" کے موقعہ پر جب ایک بڑی جوشیلی تقریر ہو رہی تھی تو میرجی نے دورانِ تقریر میں ہنستے ہوئے یہ فرمایا اے بھائی صاحب

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

مسلمان بھائی بھائی ہیں

ایک دن میں پریڈی اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پر کھڑا بوٹ پالش کروا رہا تھا۔ کہ ایک دڑھیل گداگر ہاتھ پھیلائے میرے قریب آیا۔ اور بولا

"مسلمان بھائی کی کچھ مدد کرو۔ ایک پیسہ یا ایک روٹی کا سوال ہے"

میں نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا۔

"مسلمان بھائی بھیک نہیں مانگتا"

دڑھیل گداگر نے ایک لمحے کے لئے میرے داڑھی مونچھ صاف چہرے کی طرف دیکھا اور بڑے غصے سے بولا۔

"اور مسلمان مونچھ داڑھی بھی تو نہیں منڈاتا ——"

میں اس غیر متوقع اور نہایت دلچسپ جواب سے چونک پڑا۔ میرا اس سے کچھ الجھنے کو جی چاہا۔ لیکن وہ مجھے فحش گالیاں دیتے ہوئے آگے نکل گیا میں سوچنے لگا کہ اگر مونچھ داڑھی لازماً حلیہ اسلامی ہے تو پھر اس مملکت اسلامیہ میں مسلمان کتنے ہیں۔

(۲)

ایک بار میں لاہور سے کراچی جارہا تھا۔ ریل کے ایک کھچا کھچ بھرے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں بمشکل بیٹھنے کو جگہ ملی۔ خانیوال اسٹیشن پر ایک بزرگ خضر صورت ہمارے ڈبے میں سوار ہوئے۔ مجھ سے انھوں نے فرمایا

"بیٹھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ دو!"

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"قبلہ ـــ ایتھے اگے ای بندے تے بندہ چڑھیا ہویا اے"

مولانا بڑے برافروختہ ہوئے۔ اور بولے

استغفراللہ۔ عجیب زمانہ آگیا ہے۔ ایک مسلمان بھائی دوسرے مسلمان بھائی کو بیٹھنے کے لئے جگہ تک نہیں دیتا"

میں نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کا کش لیکر مولانا چراغ حسن حسرت کی طرح گل جھاڑتے ہوئے عرض کیا

"میرے قبلہ محترم مسلمان جگہ کے لئے بھیک نہیں مانگتا"

مولانا آگ تو تھے ہی بگولا بھی بن گئے۔ اور پھر کچھ مرنے مارنے والا منظر

پیش آگیا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا (جیسی کہ لوگوں کی عام عادت ہوتی ہے) بعد ازاں غالبًا ایک ضعیف العقیدہ اور لمبی داڑھیوں کے تقدس سے مرعوب ہونے والے مریل بزرگوار آگے بڑھے اور بصد ادب و بہ ہزار احترام مولانا کی خدمت میں عرض پیش کی۔

"یا حضرت۔ آپ میری نشست پر تشریف رکھیں"

مولانا کو اور کیا چاہیے تھا۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اگر وہ انکی نشست پر تشریف رکھیں گے تو وہ کہاں تشریف رکھیں گے۔ دھم سے ان کی نشست پر تشریف فرما ہو گئے۔ اب ان کی بلا سے کہ نشست کی پیش کش کرنے والا ڈبے میں کھڑا رہے یا سنڈاس میں جا بیٹھے (استفادہ از محاورہ مردہ جنت میں جائے چاہے دوزخ میں)

گاڑی چل پڑی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اونگھ گیا۔ جب جاگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی مولانا اکنی چوٹ پر تاش (یعنی جوا) کھیل رہے ہیں۔ میں نے کسی کو مخاطب کئے بغیر بآواز بلند کہا۔

"جزاک اللہ۔ عجیب زمانہ آگیا ہے۔ ایک مسلمان بھائی دوسرے مسلمان بھائی کو جوا تک کھیلنے نہیں دیتا۔

ڈبے کے سارے نوجوان ہنس پڑے۔ اور سارے بوڑھے غضبناک نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

(۳)

ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی آباد کاری کے سلسلے میں

شہریوں کی طرف سے ایک جلسۂ عام تھا۔ میں ایک .... خانہ بدوش مہاجر ہزار امیدیں لئے اس جلسہ میں شریک ہوا۔ ایک لیڈر منہ میں کف بھرے جوشیلی تقریر فرما رہے تھے۔

"مسلمان بھائیو!"

میں اس وقت صرف انصار سے مخاطب ہوں۔ ان سے میری یہ درخواست ہے۔ کہ ہندوستان سے لٹے پٹے آنے والے تباہ حال مہاجر بھائیوں کی ہر ممکن مدد کرو۔ ان مصیبت زدہ انسانوں کے لئے تم نہ صرف اپنے دل کے دروازے بلکہ گھر کے دروازے بھی کھول دو۔"

یہ سن کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا

تو۔ مائی ڈیر جلیس۔ پہلے کھو کھرا پار تھا۔ اب بیڑا پار ہے۔"

میں نے بڑی آسانی سے ان مقرر صاحب کے گھر کا پتہ معلوم کیا۔ اور اپنا بستر اور سوٹ کیس اٹھائے ان کے گھر پہنچا۔ مقرر صاحب اس وقت غسل فرما رہے تھے۔ نوکر نے دروازہ کھولا میں شکل و صورت سے چونکہ "نجیب الطرفین" معلوم ہوں۔ اس لئے اس نے مجھے مقرر صاحب کا رشتہ دار یا گہرا دوست سمجھا۔ اور مجھے دیوان خانے میں بٹھا دیا۔ دیوان خانہ بڑا آراستہ و پیراستہ تھا۔ فرش پر ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں سنگار دان میز۔ دوسرے کونے میں لکھنے کی میز آتشدان کے قریب ایک پلنگ۔ کھڑکیوں کی طرف ایک مخملین صوفہ سیٹ، چھت

پر بجلی کا پنکھا' دیوار میں لگا ہوا۔ وارڈروب' دیوان خانے سے متصل غسل خانہ اور ٹٹی ــــ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تو سامنے والے مکان کی کھڑکی میں ایک خوبصورت لڑکی بھی نظر آ گئی۔ یعنی کچھ رومانس زدہ مالنس کا بھی موقعہ تھا اسی لئے میری خوشی جو تقریر سننے کے بعد انتہا تک پہنچ گئی تھی مقرر صاحب کے مکان کو دیکھنے کے بعد انتہا سے بھی گزر گئی۔ میں نے اپنا بستر کھولا۔ پلنگ پر بچھا دیا۔ سوٹ کیس سے کپڑے نکالے۔ وارڈروب میں ٹانگ دیئے۔ سیفٹی ریزر۔ صابن۔ ٹوتھ پیسٹ۔ برش۔ کریم وغیرہ سنگاردان کی میز پر قرینے سے جا دیئے۔ کتابیں بک شلف میں لگا دیں۔ سنگاردان کے قد آدم آئینے کے سامنے بیٹھ کر شیو کیا۔ اور پھر غسل خانے میں شاور کے نیچے نہا کر تولیہ سے سر پونچھتا ہوا باہر نکلا تو دیکھا کہ صوفے پر صاحب خانہ یعنی مقرر صاحب تشریف فرما ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حضور ــــ السلام علیکم

انھوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ البتہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے غصے سے پوچھا

کون ہو جی تم ــــ؟

میں نے بکمال سادہ لوحی جواب دیا

"ہندوستان سے آیا ہوا ایک لٹا پٹا مہاجر"

امید تھی۔ کہ یہ جواب سن کر مقرر صاحب لاجواب ہو جائیں گے

اور جہاں انھوں نے مجھ پر اپنے گھر کا دروازہ کھولا تھا اپنے دل کا دروازہ بھی کھول دیں گے۔ لیکن یوں محسوس ہوا جیسے میرا جواب عنعہ بن کران کے سارے جسم میں پھیل گیا۔ چیخنے لگے

"غنڈے۔ بدمعاش۔ یہ تمھارے باپ کا مکان ہے جس پر تم نے قبضہ جما رکھا ہے۔ اٹھاؤ اپنا سامان اور بھاگ جاؤ یہاں سے — یوں اپنا سامان جمع کر رکھا ہے جیسے یہ کمرہ تیرے لئے ہی تو محفوظ رکھا گیا تھا۔"

میں نے عرض کیا۔

"قبلہ — ابھی چند گھنٹے پہلے ایک جلسے میں تقریر فرماتے ہوئے آپ نے انصار کو نصیحت فرمائی تھی کہ ہندوستان سے آنے والے مصیبت زدہ انسانوں کے لئے تم اپنے گھر کے دروازے تک کھول دو۔ اسی لئے میں.....

مقرر صاحب چیخ پڑے۔

"بس — بکواس نہ کرو۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا اٹھاؤ اپنا سامان ورنہ ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔"

انھوں نے پولیس کے بجائے گھر کے نوکروں کو بلایا۔ اور میرا بستر کپڑے اور کتابیں اٹھا اٹھا کر باہر سڑک پر پھینکنے میں اپنے نوکروں کا خود بھی بڑا ہاتھ بٹایا۔

سڑک پر لوگ جمع ہو گئے تھے (جیسی کہ لوگوں کی عام عادت ہوتی ہے) میں اپنا منتشر سامان سمیٹ رہا تھا۔ ہر گھر کی کھڑکیوں اور چھتوں سے عورتیں جھانک رہی تھیں۔ اور سامنے والے گھر کی خوبصورت لڑکی کھڑکی میں کھڑی ہنسی کے مارے دوہری ہوئی جا رہی تھی

ایک بار پھر اپنا سامان کندھے پر اٹھا کر (یعنی سچ مچ خانہ بدوش ہو کر) میں نے جو کچھ ہوا اس پر غور کیا اور ایمان سے بڑی ندامت ہوئی۔ میں اپنے سامان کے بوجھ سے نہیں۔ بلکہ شرم سے پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا۔ غلطی یقیناً میری تھی۔ ان مقرر صاحب کا اس میں کیا قصور تھا۔ انھوں نے جو نصیحت کی تھی۔ وہ انصار کو کی تھی۔ لیکن میں بھی کتنا بدھو ہوں کہ انصار کے گھر جانے کے بجائے مقرر صاحب کے گھر چلا گیا۔ مقرر صاحب تو صرف لیڈر ہیں۔ راہ نما۔ صرف راستہ بتاتے ہیں۔ اگر کوئی مجھ جیسا بدھو ان کے گھر ہی کو منزل سمجھ بیٹھے۔ تو اس میں ع

زیاں تیرا ہے یا میرا؟

توبہ توبہ کیسی زبردست بھول ہوئی میں نے شرمندگی کی شدت سے متاثر ہو کر اپنی انگشت شہادت دانتوں سے کاٹ لی تاکہ دنیا کو "انگشت بدنداں" نظر آؤں اور دنیا کہہ اٹھے۔

"واہ بھئی واہ ـــــ کیا شرمیلا مہاجر ہے!"

(نوٹ :- اس جملے کو عوام الناس اوقات فرصت کی گفتگو میں بطور تفنن طبع یا دوست احباب کو چھیڑنے کے لئے بلا تکلف استعمال کر سکتے

ہیں۔میری طرف سے اجازت ہے)

(۳)

ایک بڑے مسلمان کو ایک بڑے ہندو کی متروکہ فیکٹری الاٹ ہوئی اس کو چلانے کے لئے انھیں چھوٹے مسلمانوں کی ضرورت تھی۔اخبارات میں اشتہار چھپے۔میں بے روزگاری سے تنگ آیا ہوا تھا۔اپنی بی اے کی ڈگری۔پروفیسروں کے صداقت نامے۔لاتعداد سفارشی خطوط اور ایک عدد درخواست لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔تو پتہ چلا کہ میری طرح کوئی ایک ہزار چھوٹے مسلمان ان کی خدمت میں حاضر ہیں۔اور اس کے علاوہ ایک ہزار ایک واں امیدوار ایک انگریز نوجوان ہے۔ہمارا انٹرویو از صبح تا شام جاری رہا۔اور بوقت شام ہمیں معلوم ہوا کہ کام کرنے میں چھوٹا مسلمان تو کجا بڑا مسلمان بھی انگریز کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔اس لئے ہمیں جواب دیا گیا کہ مسلمان اچھے کاریگر نہیں ہوتے۔صرف اچھے بھائی ہوتے ہیں

ناچار ہم ایک ہزار چھوٹے مسلمان بے نیل و مرام سڑکوں پر نکل آئے تو اچانک فضا دھنواں دار ہوگئی۔ہماری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگے اور جسموں پر لاٹھیاں برسنے لگیں۔بھگدڑ مچی۔شور و غوغا ہوا

اور پھر جب سناٹا ہوا اور میں نے لاٹھیوں کی مار سے دکھتے ہوئے جسم کو دباتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔

"بھئی۔یہ "طیراً ابابیل" والا کیا واقعہ پیش آیا؟"

اس نے چوٹیں سہلاتے ہوئے جواب دیا

" غلط فہمی ــــــ صرف غلط فہمی - پولیس نے یہ سمجھا کہ یہ جہاں جرین نے کوئی خلاف قانون جلوس نکالا ہے اور دفعہ ۱۴۴ کو توڑ رہے ہیں - اس لئے پولیس نے پہلے اشک آور گیس چھوڑی اور اس کے بعد لاٹھیوں سے ناکام امیدواروں پر اس محاورے کا استعمال کیا (مرے پر سو درّے)

بعد میں پولیس والوں کو پتہ چلا کہ یہ بیچارے تو نوکری کے ایک انٹرویو سے واپس آنے والے ناکام امیدوار ہیں تو پولیس کو بڑا افسوس ہوا - چونکہ پولیس والے بھی اپنے مسلمان بھائی ہیں - اس لئے غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی آنکھوں میں خود ہی اشک آور گیس چھوڑ ڈالی اور اپنی ہی لاٹھیوں سے اپنے جسم پیٹ رہے ہیں

یہ سن کر میں عش عش کرنے لگا کہ مسلمان پولیس والے بھائیوں اور مسلمان بیروزگار بھائیوں کو ایک دوسرے کے دکھ درد کا کتنا خیال ہے

(۵)

میکلوڈ روڈ پر سے ایک بہادر مسلمان دوست کے ساتھ گذر رہا تھا - وہ فرقہ وارانہ فسادات کے دور میں اپنی بہادری کے قصے بالکل

واقعات سنا رہے تھے۔ کہ کس طرح انھوں نے سینکڑوں مسلمان ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کو کافروں کے قبضے سے چھڑایا اور بچایا ہے۔ ابھی قصے یا واقعات جاری تھے کہ ایک ماہ وش خوبصورت پری پیکر نوجوان لڑکی سڑک پر نظر آگئی بہادر مسلمان دوست اچانک واقعے یا قصے سنانا بھول گئے۔ مجھے بھول کر۔ خود بھول کر قدم تیز کر کے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور گنگنانے لگے۔

"آجا کہیں دور چلیں
اس دنیا کی آنکھوں سے
ہائے رے ہائے"

میں نے سرگوشیانہ لہجے میں ان سے کہا

"بھائی بہادر مسلمان صاحب۔ یہ تو اپنی مسلمان بہن ہے"

انھوں نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں سہم کر رہ گیا پیچھے رہ گیا اور سوچنے لگا کہ غلطی اب بھی میری ہے۔ ہر عورت چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ اگر نوجوان اور خوبصورت ہے تو بلاشبہ "کافر" ہے۔ اور پھر "کفر" اور "مسلمانی" کا تو پرانا ——— بہت پرانا بیر ہے۔

(۶)

شہر کے سارے سینما گھروں میں ہندوستانی فلم دکھائے جا رہے ہیں - اور شہر کی دیواروں پر اشتہارات چسپاں ہیں۔ جن میں ہر

مسلمان بھائی سے اپیل کی گئی ہے کہ ہندوستانی فلموں کا بائیکاٹ کریں
کیونکہ اس طرح مسلمان بھائیوں کا سارا سرمایہ ہندو سرمایہ داروں کی جیب
میں جا رہا ہے۔ لہٰذا اسلامی "صنعت فلم سازی" کے تحفظ کی خاطر ہر مسلمان
بھائی کا فرض ہے کہ وہ مسلمان بھائیوں کی بنائی ہوئی فلمیں دیکھیں۔

اس اپیل پر ملک کے گوشے گوشے میں بڑی گہما گہمی ہو رہی ہے۔

میں خود اس خیال کا حامی ہوں۔ میں نے مسلمان بھائیوں کی بنائی ہوئی فلمیں
دیکھیں ہیں۔ مجھے وہ فلمیں ہندوستانی فلموں سے کسی طرح بھی کمتر نظر نہیں
آتیں۔ اگرچہ ہماری فلمیں غیر دلچسپ اور بہت بور ہوتی ہیں۔ لیکن اگر
ہم مسلمان بھائی ہیں تو دوسرے بھائی کی بوریت کو برداشت کرنا پڑے گا

اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کہ دولت امیر مسلمان بھائیوں کی جیب میں جایا
کرے گی۔ اگر وہ امیر ہیں تو کیا ہوا مسلمان تو ہیں۔

(۷)

مال روڈ کے ایک بس اسٹاپ پر بس سے اتر رہا تھا کہ کسی نے میری
جیب کاٹ لی جس میں میری ایک ماہ کی تنخواہ تھی۔ میں نے جیب کاٹنے والے
کو "رنگے ہاتھوں" پکڑ لیا اس کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا کہ لوگ باگ
نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا

"ارے صاحب۔ جانے دیجئے۔ خواہ مخواہ بیچارہ
جیل ٹھونس دیا جائے گا۔ جیب کترا ہوا تو کیا ہوا۔ آخر اپنا
مسلمان بھائی ہے"!

مجھ پر اس نصیحت سے بڑی رقت ہوئی میں رو پڑا۔ معلوم ہوا کہ میں اپنے ہی مسلمان بھائی کو جیل میں ٹھنسوانے جا رہا تھا۔ میں رو رو کر گڑ گڑا کر اپنے مسلمان گرہ کٹ بھائی سے اس وقت تک مسلسل معافی چاہتا رہا، جب تک کہ اس نے معاف کر کے دوسرے مسلمان بھائی کی جیب پر ہاتھ صاف نہ کیا۔

(۸)

کراچی کے شراب خانوں کے مالکان میں زبردست مسابقت شروع ہوئی۔ ہندو اور پارسی شراب فروش بھائیوں کے مقابلے میں خوب دولت کما رہے تھے۔ مسلمان شراب فروشوں کی رگ حمیت اسلامی پھڑک اٹھی۔ انھوں نے شہروں میں پوسٹر لگا کر اور لاؤڈ اسپیکر لگی ہوئی گاڑیوں کے ذریعے مسلمان بادہ خوار بھائیوں کو ان کے اسلامی فرائض سے آگاہ کیا۔

نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہندو اور پارسی شراب فروشوں کے شراب خانے "سونے" ہو گئے اور مسلمان شراب فروش بھائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہونے لگے۔ جو مسلمان بھائی عادی شرابی تھے۔ اسلامی جذبے سے معمور اور زیادہ پینے لگے۔ اور جو نہیں پیتے تھے۔ انھوں نے بھی پینا شروع کر دیا۔ تاکہ مسلمان بھائیوں کو فائدہ پہنچے۔

(۹)

پچھلی اتوار ریس کھیلنے گیا۔ سب سے اچھا جاکی ہندو تھا۔ لیکن

ریس کورس پر ایک ہنگامہ تھا۔ ہر شخص مجھے اور دوسروں کو مشورہ دے رہا تھا کہ ہندو جاکی کا بائیکاٹ کرو۔ مسلمان جاکی پہ کھیلو۔
ریس حرام سہی لیکن کیا کیا جائے۔ مسلمان جاکی بھی تو اپنا بھائی ہے۔
میں نے ہندو جاکی کو دھتا بتا دیا۔

اک مر گیا غریب

پُرانے زمانے میں ایک مقولہ بہت مشہور تھا کہ صحت بڑی دولت ہے۔ لیکن جب نیا زمانہ آیا ہے۔ اور اس نے پرانے زمانے کی ہر چیز کو الٹ پلٹ دیا تو یہ مقولہ بھی سر کے بل آ گیا۔ چنانچہ اب وہ مقولہ یوں ہے —— دولت بڑی صحت ہے۔

میں آپ کے بارے میں تو کہہ نہیں سکتا۔ البتہ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جس دن میری جیب خالی ہوتی ہے۔ اس دن مجھے بخار ہو جاتا ہے پنڈا پھنکنے لگتا ہے۔ جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ جی چھوٹنے لگتا ہے۔ دل دھڑکنے

لگتا ہے۔ طبیعت اتنی چڑچڑی ہو جاتی ہے کہ سامنے آنے والے ہر آدمی کا منھ نوچ لینے کو جی چاہتا ہے ——— اس دن سارا دن میں بستر پر پڑے پڑے کبھی جمائیاں لیتا ہوں تو کبھی سو جاتا ہوں ——— لیکن جس دن چاندی کا ایک بھی سکّہ یا کرنسی کاغذ کا ایک بھی ٹکڑا ہوتا ہے۔ میں بڑا چاق و چوبند ہشاش بشاش اور گنگناتا مسکراتا رہتا ہوں۔ جمائیوں کی جگہ مسکراہٹیں اور اور پژمردگی کی جگہ تابندگی چہرے پر کھیلتی رہتی ہے ——— بخدا بالکل "اسپورٹسمین" لگتا ہوں۔

یہ بات اگرچہ میں نے اپنے بارے میں بتائی لیکن آپ یوں محسوس کر رہے ہیں جیسے آپ کے دل کی بھی بات بتا دی ہے۔ یا پھر اپنا نام لے کر آپ کا راز بھی فاش کر دیا ہے ——— دراصل ایک غریب دوسرے غریب کو پہچانتا ہے۔ آپ تو اپنی باتیں بناتے ہوئے جھوٹی شرم سے کام لیتے اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ لیکن خیر کوئی ہرج نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ آپ بیٹھے شرماتے رہیں۔ میں آپ کے ایک ایک راز کو فاش کرتا رہوں گا (تاکہ آپ مارے شرم کے میرے سامنے کبھی سر نہ اٹھا سکیں۔

یہ صرف میرا اور آپ کا ذاتی تجربہ نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ زمانے کا یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جتنے دولت مند آدمی ہوتے ہیں۔ وہ بڑے موٹے تازے تگڑے اور صحت مند ہوتے ہیں۔ اور جتنے غریب آدمی ہوتے ہیں۔ وہ دبلے پتلے سوکھے مریل اور مریض ہوتے ہیں۔ اس لئے

کسی انسان کے بارے میں یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ کون انسان دولت مند ہے اور کون انسان غریب ہے - ؟ جو آدمی صحت مند ہے اور اس کا پیٹ بڑا ہے - وہ امیر یا دولت مند آدمی ہے - آپ نے یہ مقولہ بھی کبھی نہ کبھی سنا ہی ہوگا کہ "سیٹھ کا بڑا پیٹ" اس کے برعکس جس آدمی جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ اور پیٹ پچکا ہوا ہے۔ اس کو پہچاننے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر وہ آدمی آپ نہیں ہیں۔ تو میں ہوں - اور اگر میں نہیں ہوں تو آپ ضرور ہیں (ذرا انکار کرکے بھی تو دیکھ لیجئے - ایمان سے وہ مزا چکھاؤں۔ کہ . . . .)

باتوں باتوں میں پیٹ آگیا ہے - اس لئے وضاحت کرنا ضروری ہے کہ پیٹ امیر اور غریب آدمی کے درمیان ایک نشان امتیاز ہے - یہاں پھر ایک بار بتادوں - کہ جس کا پیٹ بڑا وہ امیر اور جس کا پیٹ چھوٹا وہ غریب آدمی ہے -

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض ملکوں میں اعداد و شمار کے محکمے اپنی آبادی سے غریب اور امیر آدمیوں کی تعداد کا اندازہ ان دکانوں سے لگاتے ہیں جو پتلون کے بیلٹ اور گیلس فروخت کرتے ہیں آپ کو معلوم ہوگا کہ امیر آدمی گیلس کی مدد سے پتلون پہنتے ہیں کیونکہ پیٹ بڑا ہونے کی وجہ سے ان کی پتلون بار بار پھسل پھسل جاتی ہے اور غریب آدمی کا پیٹ چونکہ پچکا ہوا ہوتا ہے - اس لئے اس کو اپنی کمر پر بیلٹ باندھنا ضروری ہو جاتا ہے - بہر حال اس لحاظ سے اگر

کسی دوکان پر بلیٹ زیادہ اور گلیس کم فروخت ہوتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ اس شہر میں یا ملک میں غریب آدمی زیادہ اور امیر آدمی کم ہیں۔

یوں بھی ساری دنیا میں امیر آدمی ایک فیصد اور غریب آدمی ننانوے فیصد ہیں۔ اور مجھ جیسے بال کی کھال نکالنے والے اس حقیقت کی یہ کھال نکالتے ہیں کہ دنیا میں صحت مند انسان ایک فیصد اور مریض انسان ننانوے فی صد ہیں۔ اسی لئے دنیا کے ہر ملک کی حکومتوں کو "صحت عامہ" کا زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں "صحت خاصہ" کا نام کبھی نہیں سنا ہوگا ـــــ مجھے کسی ایسے ملک کا پتہ دیجئے جہاں "صحت عامہ" کے محکمے کے ساتھ "صحت خاصہ" کا بھی کوئی محکمہ قائم ہے۔ ویسے یہ دوسری بات ہے۔ کہ ہر ملک میں صحت عامہ کا محکمہ "عامہ" سے روگرداں ہو کر "خاصہ" کی صحت کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے پاس روپیہ ہوتا ہے۔

میرے پاس صرف کاغذ اور قلم ہے۔ لیکن اگر میرے پاس کوئی ڈنکا بھی ہوتا تو میں اس پر چوٹ مار کر یہ دعوئے کرتا کہ انسان کی صحت صرف روپیہ پیسہ میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ جب کبھی میں بیمار ہوتا ہوں تو میں کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا۔ بلکہ سیدھا کسی مالدار دوست کے پاس جا کر روپیہ پیسہ حاصل کرتا ہوں اور "ہوا الشافی" ہو جاتی ہوں۔

انسان کی صحت کا دارومدار غذا، پانی، ہوا، مکان اور لباس

ہے۔ اگر آپ اچھی غذا کھاتے ہیں۔ اچھا پانی پیتے ہیں۔ اچھی ہوا کھاتے ہیں اچھے مکان میں رہتے ہیں اور اچھا لباس پہنتے ہیں تو آپ صحت مند آدمی ہیں۔ لیکن اچھی غذا، اچھے پانی۔ اچھی ہوا۔ اچھے مکان اور اچھے لباس کے لیے روپیہ چاہیے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ یعنی آپ کے پاس روپے کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی صحت اچھی نہیں ہے (علاج کرائیے حضرات!)

صحت روپیہ ہے، اور روپیہ صحت۔ روپیہ غریب آدمی کے پاس نہیں ہے اور غریب آدمی روپیہ کے پاس نہیں۔ یہ دنیا کا روز مرہ کا ایک کھیل ہے

آپ ذرا اپنی زندگی پر غور کیجیے۔ آپ جو غذا کھاتے ہیں۔ اس کے اچھے یا برے ہونے کو تو چھوڑیے۔ وہ آپ کا پیٹ کبھی بھر نہیں سکتی۔ جب آپ پیٹ نہیں بھر سکتے ہیں تو آپ کا جسم کس طرح بھر سکتا ہے۔ انسان کا جسم کبھی بالکل اناج کی بوری ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم آپ صرف بوری ہیں جس میں اناج نہیں ہے۔

آپ جو پانی پیتے ہیں۔ وہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ کیونکہ آپ کے گھر میں نلکا نہیں ہے۔ آپ وہ پانی پیتے ہیں جو ماشکی اپنی مشک میں بھر کر آپ کے گھڑوں میں اور صراحیوں میں بھرتا ہے۔ آپ پانی تو پی لیتے ہیں اور پیتے رہتے ہیں۔ لیکن کبھی آپ نے ماشکی کی مشک کے اندر بھی جھانک کر دیکھا ہے کہ اس میں کتنا میل ہوتا ہے۔ میں نے ایک

مشک کے اندر جھانک کر دیکھا تو تو یہ میری ——

—— خی خی خی ——!

ہوا —— اچھی ہوا شہر کے باہر ہوتی ہے - اور آپ گنجان شہر میں رہتے ہیں - چنانچہ جب آپ سانس لیتے ہیں تو ہوا کے بجائے یا در چنجانے کا دھواں، قریب ہی کی اگلی ہوئی سانسوں سے بنی ہوئی ہوا آپ کے جسم میں داخل ہوتی ہے

آپ جس مکان میں رہتے ہیں - وہ بوسیدہ تنگ و تاریک ہوتا ہے جس میں آپ کی زندگی پھیلنے بڑھنے کے بجائے سمٹنے سکڑنے لگتی ہے -

آپ جو لباس پہنتے ہیں - وہ میلا کچیلا اور گندہ ہوتا ہے جو خود ایک بیماری کی طرح آپ کے جسم سے لپٹا ہوا ہوتا ہے - میلے کچیلے گندے کپڑوں میں آدمی صد فیصد بیمار رہتا ہے - آپ نے خود بھی محسوس کیا ہوگا کہ جس دن آپ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں اس دن آپ کا جسم بھی کھلا کھلا سا محسوس ہوتا ہے - طبیعت ہشاش بشاش رہتی ہے اور چہرے پر چمک اور رونق آجاتی ہے - لیکن چونکہ اچھے اور صاف ستھرے کپڑے آپ صرف جمعہ کے دن پہن سکتے ہیں - اس لئے ہفتہ کے چھ دن آپ بیمار رہتے ہیں -

اس کے برعکس آپ دولت مند آدمیوں کو دیکھئے - وہ اچھی غذا کھاتے ہیں - اچھا پانی نہیں ملتا تو خوب . . . . . . پیتے ہیں - ہوا خوری

کے لئے ہر شام کار میں بیٹھ کر دریا کے کنارے یا کسی پرفضا باغ یا کسی کھلے جنگل میں جاتے ہیں۔ ان کی سانس میں باورچی خانے کا دھواں نہیں بلکہ روح افزا عطریات کی خوشبو ہوتی ہے۔ وہ اچھے مکان میں رہتے ہیں جس میں آرام دہ فرنیچر اور ہوادار کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ ہر روز صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود جب کبھی کوئی آدمی بیمار ہوتا ہے تو دوائی خریدنے کے لئے اس کے پاس روپیہ ہوتا ہے۔ وہ روپیہ نکال کر چٹ دوائی منگاتا ہے اور جھٹ صحت یاب ہو جاتا ہے۔ امیر کے گھر میں ایک بیمار ہوتا ہے اور اس کے لئے صد انار آجاتے ہیں اور غریب کے گھر ایک انار آتا ہے۔ تو سو بیمار ہوتے ہیں۔

اب ذرا غریب آدمی کی بیوی ہی کو دیکھئے۔ کالی مریل چرخ صورت دیکھتے ہی ہیضہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس میں بیچاری غریب عورت کا کیا قصور۔ اس کو یہ کھانے کو ملتا ہے کہ جسم میں خون پیدا ہو اور جس کی تابانی سے چہرہ منور اور جسم گرم ہو۔ اور نہ اچھے کپڑے جو اس کی "عورتیت" کو نکھار عطا کریں

آپ روز دیکھتے رہتے ہیں کہ غریب آدمی بہت جلد مرتے ہیں اور روز روز مرتے رہتے ہیں۔ جب موت جلدی نہیں آتی تو خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف امیر آدمی اسی وقت مرتے ہیں جب ان کی طبعی موت آجاتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ کسی

امیر آدمی نے کبھی خودکشی کی۔ یا وقت سے پہلے مر گیا ——؟ ہاں البتہ کسی عورت کو حاصل نہ کرنے کے غم میں کوئی امیر آدمی خودکشی کرلے یا وہ مرغابیوں کا شکار کھیلتے ہوئے پانی میں ڈوب مرے تو پھر یہ دوسری بات ہے۔ اس کو حادثہ سمجھتے ہیں۔

امیر آدمی بالعموم ایک ہی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور اس مرض کا نام ہے قبض۔ لیکن غریب آدمی ہزارہا امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ نمونیا ملیریا۔ ٹائیفائڈ۔ ہیضہ۔ پلیگ سوکھیا۔ کھانسی۔ نزلہ وغیرہ۔ وغیرہ۔

میں یہ دعوےٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر دنیا میں نہیں تو کم از کم اپنے ملک میں اگر ہر انسان کو پیٹ بھر روٹی۔ شفاف پانی۔ کھلی ہوا۔ ہوادار مکان اور صاف ستھرے کپڑے میسر آجائیں تو اس ملک میں نہ ہسپتال کی ضرورت ہے اور نہ ڈاکٹر کی (—— قبرستان کی تو خیر مجبوری ہے)

یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ دنیا میں جتنی دولت پیدا ہوتی ہے۔ وہ سارے انسانوں میں مساوی مساوی بانٹ دی جائے تاکہ ہر انسان کو پیٹ بھر روٹی۔ تن بھر کپڑا۔ اور خاندان بھر مکان ملے اس سے اور کچھ ہو نہ ہو حضرت عزرائیل علیہ السلام جو صدیوں سے کام کی زیادتی کے باعث زمین پر رہ گئے ہیں۔ انھیں آرام مل جائے گا۔ اور فرصت کے اوقات میں آسمان پر بھی جا سکیں گے۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ انھیں آسمان پر واپس گئے کتنا طویل عرصہ ہو چکا ہے!

آخر میں ہمیشہ یاد رکھنے کے لئے میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ جب تک انسان دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ یعنی دولت چند آدمیوں کے پاس ہے اور لاکھوں کروڑوں آدمی خالی جیب ہیں۔ اس وقت تک انسان مریض رہے گا ـــــ اس کا صحت یاب ہونا مشکل ہے

میں نے یہ بات صرف یاد رکھنے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس پر عمل کرنے کے لئے بھی کہی ہے۔ اگر آپ اس پر عمل نہ کریں تو پھر صاحب شوق سے مرجایئے۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔

میرا کام آپ کو سمجھانا ہے۔ اور اگر آپ کا کام صرف مرجانا ہی ہے تو بسم اللہ ـــــ ضرور مرجایئے تاکہ خس کم ہوں اور جہاں پاک ہو ـــــ البتہ ایک گزارش ہے کہ مرنے سے پہلے مجھے ضرور مطلع کیجئے تاکہ میں آپ کے جنازے میں شریک ہونے کی کوشش کروں۔ اگر جنازے میں شریک نہ ہو سکا تو کم از کم آپ کی یاد میں ایک مضمون تو لکھ ڈالوں ـــــ!

ہاں تو فرمایئے! مرنے کا ارادہ ہے؟

نچ موڑتوں

جیسا کہ وطنِ عزیز پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے میں ایک بڑا ہی بہادر آدمی ہوں۔ میری کسی جھنڈے بنانے والے سے دوستی نہیں ہے ورنہ آپ دیکھتے کہ میری بہادری کے جھنڈے اس برصغیر کے چپے چپے پر گڑے ہوتے۔ باوجود اس کے یہ حقیقت ایک طرف شہرۂ آفاق اور دوسری طرف زبان زدِ خاص و عام ہے کہ میں دنیا کا بڑے سے بڑے اور خطرناک سے خطرناک کام کرنے سے بھی کبھی نہیں ڈرتا حتیٰ کہ جہاں آنکھوں میں ڈالنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی وہاں بھی اپنی

جان (جان بوجھ کر) جوکھوں میں ڈال دیتا ہوں تاکہ مشق جاری رہے۔ ورنہ کہیں وقت ضرورت یہ کہہ کر شرمندہ نہ ہونا پڑے کہ یارو چونکہ پریکٹس چھوٹ گئی تھی۔ اس لئے جان جوکھوں میں نہ ڈال سکا۔

پوسٹریا ہینڈ بل کے الفاظ میں" میں نہ تو حاکم ملک سے گھبراتا ہوں اور نہ بھوت پریت سے، نہ شیر سے ڈرتا ہوں اور نہ بیوی سے —— آزمائش شرط ہے۔ بندہ ہر دم حاضر ہے" —— لیکن ان ساری بہادریوں کے باوجود آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی۔ اور انگشت بدنداں ہو جائیں گے۔ (ہمارے ملک میں اظہار تعجب کا فی الحال یہی ایک طریقہ رائج ہے) کہ اتنا جری اور اتنا دلیر ہونے کے باوجود میں صرف ایک چیز سے ڈرتا ہوں اور وہ ہے اپنے پیارے وطن کی سڑک۔

آپ یہ سن کر شائد ہنس پڑیں یا مسکرائیں ضرور۔ جیسے میں نے کوئی پہاڑ کھود کر چوہا نکالنے والا کام انجام دیا ہو۔ مگر واضح رہے کہ میں نہ کوہکن فرہاد کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور نہ کسی میونسپلٹی کا ملازم ہوں کہ چوہے پکڑتا پھروں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے آپ کی ہنسی کی کوئی پرواہ نہیں۔ کیونکہ آپ دنیا والے ہیں اور دنیا والوں کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ پہلے پہلے دنیا کے ہر بڑے آدمی پر ہنستے ہیں اور بعد میں خفت اٹھاتے ہیں۔

آج آپ ہنس لیں یا کل خفت اٹھائیں لیکن پرسوں جب آپ (خدانخواستہ) کسی موٹر، ٹرام، تانگہ، گھوڑا گاڑی، رکشا اور سائیکل کی

لپیٹ میں آجائیں گے۔ تب آپ کو پتہ چلے گا کہ پاکستان و ہندستان
کا واحد دلیر الشان مسٹر ابراہیم جلیس وطن عزیز کی کسی سڑک پر آکر اتنا بزدل
کیوں ہو جاتا ہے ۔۔۔!؟

مجھے اعتراف ہے کہ ہر روز صبح جب میں اپنے گھر سے نکل کر شہر
کی سڑکوں پر آجاتا ہوں تو میری ساری بہادری رفو چکر ہو جاتی ہے
اور میں ایک بے حد ادنیٰ اور ذلیل قسم بزدل کی طرح گھبرایا، سہما،
ٹھٹکتا، جھجکتا، پھونک پھونک کر قدم رکھتا چلتا ہوں جیسے کسی سرکس کا
اکیڑ ہوا میں معلق رسی یا تار پر چلتا ہے۔ جہاں کسی موٹر کا ہارن، ٹرام کا گھنٹہ
سائیکل کی گھنٹی، رکشا والے کی فحش گالی اور تانگے والے کی "بچ موڑ توں"
سنتا ہوں تو اوپر کا سانس نیچے رہ جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد دل زور
زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اور بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کا عالم طاری ہو جاتا
ہے۔ ایک ایک پاؤں من من بھر کا ہو جاتا ہے۔ چلنا چاہتا ہوں چلا نہیں
جاتا۔ چلا نہیں جاتا پھر بھی چلنا پڑتا ہے کیونکہ (کسی نے کیا خوب کہا ہے)

ے رکنا تیرا کام نہیں چلنا تیری شان

میں نے پل صراط تو نہیں دیکھی البتہ "دی وررلڈ فیمس پکچرز" میں اس
کی ایک تصویر دیکھی ہے۔ شاید میٹرو گولڈن میئر کی ایک فلم میں بھی اس
پل کو دیکھا ہے۔ کتابوں میں بھی اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور
بزرگوں سے بہت کچھ سنا ہے اور اسی دیکھنے پڑھنے اور سننے سے میں
نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ بندر روڈ یا انارکلی پل صراط کا جدید یا ماڈرن نام

اور پل صراط بندر روڈ یا انار کلی کا پرانا اور تاریخی نام ہے۔ پل صراط اور انار کلی میں میں نے جو کچھ فرق محسوس کیا ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ پل صراط پر سے آدمی مر کر گرتا ہے۔ اور انار کلی پر گر کر مرتا ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں مرنے سے ڈرتا ہوں۔ اجی توبہ کیجئے۔ مرنے سے بھلا میں ڈر سکتا ہوں۔ یعنی میں؟ یعنی ابراہیم جلیس؟؟ لو جی لو حد ہو گئی۔ میں جینے سے نہیں ڈرتا تو مرنے سے بھلا کس طرح ڈر سکتا ہوں!! آپ ہی کہئے کہ اس معدودے چند دولت مندوں کی دنیا میں انسان کی موت ڈراؤنی ہے یا زندگی ــــــ؟

پرانے زمانے کے لوگ موت سے ڈرنے کو بہادری سمجھتے تھے چنانچہ مشہور بادشاہ جولیس سیزر نے کہا تھا (جولیس سیزر اتنی دانشمندی کی بات نہیں کہہ سکتا۔ وہ تو جولیس سیزر کی طرف سے ولیم شکسپیر نے کہا تھا کہ) بزدل اپنی طبعی موت سے پہلے کئی کئی بار مرتا ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے زمانے میں لوگ یا ان سب کا نمائندہ یعنی میں اکیلا زندگی سے نہ ڈرنے کو بہادری سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں زندگی کو بڑا بچا بچا کر رکھتا ہوں تاکہ روز روز اسے پچھاڑ کر خوش ہوتا رہوں۔ اب جب کہ میں زندگی کو اس طرح موت کے چنگل سے بچا بچا رکھتا ہوں تو کیا میں ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا کر سکتا ہوں کہ میری اتنی چہیتی اتنی پیاری زندگی کسی ٹرام سے کٹ کر یا کسی موٹر کار کے نیچے دب کر ختم ہو جائے۔ میں ایسی موت مرنے والوں کو مرنے والا ہرگز تسلیم نہیں

کر سکتا۔ بلکہ ایسی موت مرنے والوں کے بارے میں تو میرا یہ خیال ہے کہ وہ مرتے نہیں بلکہ مرنے کی توہین کرتے ہیں۔

موت کے بارے میں تو میری خواہش بڑی نرالی ہے۔ میں کوئی یادگار موت مرنا چاہتا ہوں۔ میں مروں گا تو کسی سیم تن گل رو حسینہ کی زلفوں کی خنک چھاؤں میں، اس کی نرم نرم آغوش میں مروں گا۔ یا کسی خطرناک مہم کو سر کرتا ہوا مروں گا یا مریخ اور چاند کے سیاروں کو دریافت کرتا ہوا مروں گا۔ حق اور انصاف اور جمہوریت کی حمایت میں قلم چلاتے چلاتے مروں گا۔ اور یا پھر کسی انسان دشمن سے لڑتا ہوا مروں گا۔ لیکن بخدا مجھے چارپائی پر بیماری سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا، سمندر میں اور چلو بھر پانی میں ڈوب کر مرنا، عورت کی محبت اور کالج کے امتحان میں فیل ہو کر یا مارگٹاری مرجانا یا پی کے زہر مرجانا۔ یا پھر بندر روڈ اور مال روڈ پہ کسی ٹرام یا کسی بس سے کٹ کر اور دب کر مرجانا۔ ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہیں۔ ان موتوں میں سب سے واہیات موت سڑک کی موت ہے۔ خدا مجھے کسی سڑک کی موت سے آشنا نہ کرے۔ آمین ثم آمین۔

آپ شائد نہیں جانتے کہ لاہور یا کراچی کی سڑکیں اتنی موت پرور کیوں ہوتی ہیں۔ آئیے میرے ساتھ کسی سڑک پر چلے آئیے۔ فٹ پاتھ پر چلنے کے خیال کو تو دل سے نکال پھینکئے تا کہ میں ایک لمبی سانس لے کر آپ کو بتاؤں کہ ہائے اب یہاں فٹ پاتھ کہاں؟ پچھلے فسر قہ دارانہ

فسادات میں پاکستان نے جہاں بہت کچھ کھویا ہے، وہاں اپنے شہروں کے فٹ پاتھ بھی گنوا دیئے ہیں۔ آپ پاکستان کے کسی شہر میں چلے جایئے آپ کو فٹ پاتھ کہیں نہیں ملیں گے۔ وہ فٹ پاتھ جنھوں نے آپ کو بچپن سے لے کر آج تک ہر خطرناک سواری کی زد سے بچا بچا کر اتنا بوڑھا بنایا ہے آج وہ کمیاب ہیں۔ آج وہ نایاب ہیں۔ اور آج یہ حالت ہے کہ آپ ادھر گھر سے باہر نکلتے ہیں اور ادھر موٹریں اور تانگے چاروں طرف سے بھوکے کتوں کی طرح آپ کی طرف دوڑتے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہیں

برخوردار! جب تک سڑکوں پر فٹ پاتھ تھے تم بڑے اکڑے اکڑے پھرتے تھے۔ اب بولو۔۔۔ کہاں بچو گے۔۔۔۔۔؟ اب تمھارے لئے کس فٹ پاتھ کا آغوش وا ہے۔ بولو اور جواب دو۔"

آپ سوائے اس کے کیا جواب دے سکتے ہیں کہ "ہائے مرا"۔ "بچاؤ میں مر گیا" اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے دن حسب ذیل تین سطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

لاہور یا کراچی ۲۵ / مئی (اسٹاف رپورٹر)

معلوم ہوا ہے کہ ایک نوجوان سیکڑ ڈرووڈ بس کے نیچے آ کر مر گیا۔ پہلے تو حسب معمول ہسپتال گیا اور وہاں سے سیدھا قبرستان چلا گیا۔ حسرت اس غنچہ پہ ہے۔۔۔۔۔۔!

اگر آپ مہاجر نہیں ہیں۔ تو پوچھیں گے۔ کہ فٹ پاتھ آخر گئے کہاں؟ اے میرے پیارے سادہ لوح دوست! کیا آپ نہیں جانتے۔ کہ اب سے ۵ سال پہلے وطن عزیز کے باشندوں نے انہی فٹ پاتھوں کو حاصل کرنے کے لئے کتنی خونریز لڑائیاں لڑی تھیں۔ کتنی بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں۔ کہ اتنی خونریزیوں اور اتنی قربانیوں سے حاصل کئے ہوئے فٹ پاتھوں پر وہ جھونپڑیاں بنائیں۔ خوانچہ گاہیں، ریڑھیاں کھڑی ہیں یا محض آپ کی چہل قدمی اور ہنر گشت کی خاطر ان سے دست بردار ہو جائیں اور اگر دست بردار ہو جائیں تو پھر رہیں کہاں —— آپ بھی تو کچھ محکمہ آباد کاری والوں جیسی حرکتیں کرتے ہیں۔

بہر حال لاہور کی سڑکوں سے فٹ پاتھوں کا جانا" عجب ایک سانحہ سا ہو گیا ہے۔" اب گھر سے نکلتے ہیں تو بیچ سڑک چلتے ہیں۔ تو پھر یہ پوچھنا بیکار ہے۔ کہ آپ موٹر کے نیچے دب کر مرنے کو ترجیح دیں گے یا لاری کے نیچے آ کر مرنے کو ترجیح دیں گے —— ؟ بلکہ آپ ابھی دونوں اموات میں سے کسی کو ترجیح دینے یا نہ دینے کے بارے میں سوچتے ہی رہیں گے۔ کہ آپ خود اس دنیا سے ترجیح پا جائیں گے۔ اور کوئی "فاتحہ نہ درود" قسم کا واقعہ رونما ہو جائے گا۔

وطن عزیز کی سڑک کے بارے میں بڑا گہرا غور و خوض کرتے کرتے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ یہاں کی ہر سڑک مرادانہ کی کمین گاہ ہے۔ میں آپ یا کوئی نتھو خیرا واضح رہے کہ کوئی آدمی سڑک پر نہیں

مرتا) وطن عزیز کی دو کانوں سے مہنگا سامان خرید نے کے بعد جب ادھمرا ہو کر سڑک پر نکل آتا ہے تو اس کا پورا پورا مرجانا بالکل یقینی ہے کیونکہ یہاں کی ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے مالکان نے اپنے اپنے ڈرائیوروں کو حکم دے رکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے کی خاطر کسی دوسری ٹرانسپورٹ کمپنی کی بس کو ہرگز ہرگز آگے نہ بڑھنے دینا۔ راہگیروں کی موت کی قطعاً پرواہ نہ کرنا۔ بس اپنی بس کو جتنی تیز دوڑا سکتے ہو دوڑاؤ اور روپیہ کماؤ۔ روپیہ کماؤ اور غریبوں کو مارو۔ جو ڈرائیور دوسری کمپنی کی بسوں کو زیادہ مرتبہ "اوورٹیک" کرے گا اور جتنے زیادہ مسافر بٹھائے گا۔ اس کو روزانہ فی مسافر یا فی مسافر کی موت ایک آنہ منافع دیا جائے گا۔ یعنی ایک آنہ مساوی ہے۔ ایک غریب آدمی کی موت کے .... تو صاحب اس تماشے اور اس" اوورٹیکا کی" نے سڑک پر وہ ہائے وائے مچا رکھی ہے کہ گھر سے نکلنے سے پہلے بچوں کو نصیحت کرنے کے بجائے بیوی کو وصیت کر کے باہر نکلنا پڑتا ہے کہ

"اچھی بی بی۔ مری جان بی بی۔ کہا سنا معاف کرو۔

کیونکہ اب ہم سڑک پر جا رہے ہیں۔ اس لئے

ع اب ہم نہ مل سکیں گے تو مجھ کو بھول جاؤ

میں جانتا ہوں کہ آج کل حکومت پاکستان پوری مستعدی کیا تھ ٹریفک کے بہتر انتظامات کی طرف توجہ دے رہی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ

ہر صبح، دوپہر اور شام ٹریفک پولیس کی ایک لاری کسی نہ کسی چوراہے پر کھڑی ہوتی ہے۔ اس میں ایک ٹریفک انسپکٹر کھڑا ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں مائیکروفون لیئے پبلک کو آوازیں دیتا رہتا ہے۔

"او، سفید اچکن والے بزرگ محترم ——!!
جب تک سپاہی ہاتھ کا اشارہ نہ دے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کیجئے!

اور بچہ گاڑی دھکیلنے والی میم صاحبہ، رک جائیے وہیں ورنہ بچہ گاڑی سمیت کسی بڑی گاڑی کے نیچے آجائینگی

"کار نمبر ۵۵ کے اد —— کار اور پیچھے لے جاؤ

"کالے برقعے والی خاتون —— چوراہوں پر اپنا چہرہ نقاب میں ڈھانک لیجئے کیونکہ خوبصورت چہرے بالعموم حادثات کا باعث اور ٹریفک کے لئے مضرت رساں ہوتے ہیں۔

اب آپ چوراہے کے ہر کونے پر نظر ڈالئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہیں۔ لیکن یہ ٹھٹ کے ٹھٹ ٹریفک کا درس لینے کے لئے جمع ہیں کہ کون شخص یا کون سواری غلطی کرتی ہے تا کہ اس پر قہقہہ لگا کر ہنسا جائے اور اسے بیچ چوراہے شرمندہ کیا جائے۔

آداب ٹریفک سکھانے والی یہ مہم بہت اچھی ہے۔ لیکن مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مہم بہت قبل از وقت ہے —— یہ بالکل

ایسی ہی بات ہے جیسے کسی مریض کو دوائی پلانے کے بجائے اس کو صرف دوائی کے خواص اور فوائد بتائے جائیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ ٹریفک کنٹرول افسر کی لاری جب تک چوراہے پر موجود ہوتی ہے تو نہ صرف لوگ بلکہ ٹریفک کنٹرول کرنے والا سپاہی تک خود بھی بڑا مستعد نظر آتا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ افسر وہاں سے ہٹا تو پھر وہی بھیڑ بھاڑ، دھینگا مشتی دھکا پیلی ٹکر، حادثے اور "ہائے میں مر گیا" وغیرہ وغیرہ ہو جاتے ہیں۔

اگر تعلیم بالغاں کے ساتھ ساتھ تعلیم نابالغاں بھی ہر باشندے کو میسر آجائے تو مجھے یقین ہے کہ ہمارے ملک کے یہ دودو ہاتھ دام اور لسّی پی پی کر سڑکوں پر اینڈتے "ٹکراتے پھرنے والے جاہل وبالغ اتنے "ٹریفک مائنڈڈ" ہو جائیں گے کہ سڑک پر چلتے ہوئے جہاں کسی کا کندھا کسی سے لڑ گیا تو انھوں نے بڑے شرمسار لہجے میں فوراً کہہ دیا۔ آئی ایم سو سوری — معاف کیجئے غلطی سے لگ گیا کندھا۔ ورنہ گندھے کی کیا مجال!

اس طرح آپ دیکھیں گے کہ وہ دور بہت قریب آ رہا ہے کہ جب ہماری سڑکوں پر چلنا پھرنا بہت کم ہو گا اور معافی چاہنا اور معافی دینا بہت بڑھ جائے گا۔

اس کا تجربہ آج بھی آپ کر سکتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ شخص سڑک پر چلے گا تو بہت دیکھ بھال کر اپنے آپ کو بچاتا بچاتا چلے گا۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک جاہل گنوار کو دیکھئے۔ وہ نہ کسی سواری کی پرواہ کرے گا اور نہ ٹریفک کے سپاہی کی سیٹی کی — بس دنیا یعنی سواری

وافیہا یعنی ٹریفک کے سپاہی سے بے خبر بیچ سڑک پر اپنے بڑے بھائی کا لنڈی کوتل سے آیا ہوا پوسٹ کارڈ پڑھتا ہوا (کہ ہم تمام یہاں خوریت سے رہ کر تمہاری خیریت بفضل اللہ تعالےٰ نیک چاہتے ہیں۔ اور تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم کبھی یہ نہ بھولو کہ تم لنڈی کوتل میں نہیں بلکہ لاہور میں ہو۔ وہاں سڑکوں پر موٹر گاڑیاں تانگے وغیرہ بہت دوڑا کرتے ہیں۔ اس لئے سڑکوں پر احتیاط سے ہوشیاری سے چلنا پھرنا ورنہ میں آکر تحصیل لنڈی کوتل واپس لے آؤں گا)

فقط تمہارا بڑا بھائی اور نوٹ - اور اپنی خیریت سے فوراً اطلاع دینا پھر ایک بار تمہارا بڑا بھائی - حتیٰ کہ اس کی خیریت کسی نہ کسی اکسیڈنٹ یا حادثے کا شکار نہ ہو جائے ۔

(گویا المضمون مختصر ———— سڑک پر چلنے کے آداب سیکھنے کے لئے، خواہ وہ لاہور یا کراچی کی سڑک ہو یا زندگی کی سڑک ۔ تعلیم نہایت ضروری ہے تعلیم نابالغاں بھی اور بالغاں بھی ۔

آپ کہیں گے کہ میں نے کہاں کی کڑی کہاں کی ملائی کہاں کی اینٹ اور کہاں کا روڑا اور میں نے مضمون جوڑا ———— کہاں بیچ موڑ توں اور کہاں تعلیم بالغاں ———— تو سنو اے میرے اہل وطن ————

دراصل میری یہ خواہش ہے کہ اگر کبھی میری حکومت زندگی اور جمہوریت کے راستے پر غلط سمت چل پڑے تو کم از کم ایک بار تو میں گلا پھاڑ کر چلاّ اٹھوں کہ "نی ھکو ملیتے ———— ! بیچ موڑ توں

اقبال اور ان کے لنگوٹیے

جس دن شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ؒ اللہ کو پیارے ہوئے اس کے دوسرے دن بلکہ شائد اسی دِن ہندوستان کے چپّے چپّے پر ایسے بے شمار لوگ نمودار ہوئے جو شاعرِ مشرق کے قریبی رشتہ دار یا ان کے گہرے دوست ہیں۔ اس دن کے بعد سے جوں جوں زمانہ گزرتا جا رہا ہے۔ علامہ مرحوم کے قریبی رشتہ داروں اور گہرے دوستوں کے غول میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ وہ دن بہت ہی نزدیک ہے جب کہ اس برصغیر پاکستان و ہندوستان کا ہر باشندہ اپنے

آپ کو علامہ مرحوم کا قریبی رشتہ دار اور گہرا دوست ظاہر کرے گا اور علامہ اقبال کے اہل و عیال منہ تکتے رہ جائیں گے۔

کاش اس ہوشربا ایجادات کے دور میں کوئی ایسا بھی آلہ ایجاد ہو جس کے ذریعہ ارواح کے نام ترسیل پیغام کا سلسلہ قائم ہو جائے تاکہ میں شاعر مشرق کی روح کو یہ اطلاع دے سکوں کہ اے عظیم روح ـــــ دیکھ تو سہی کہ تیرے قریبی رشتہ دار اور گہرے دوست تیرے کتنے وفادار ہیں۔ تو نے انھیں جو نصیحت کی تھی اس پر وہ تیری زندگی کے آخری لمحہ تک پورے استقلال کے ساتھ عمل پیرا رہے۔

یہاں آپ شائد یہ سوچ رہے ہوں کہ میں بھی اگر اقبال کا رشتہ دار نہیں تو کم از کم ان کا گہرا دوست ضرور ہوں۔ آپ کا خیال صد فیصد ٹھیک ہے۔ ورنہ اگر میں ان کا گہرا دوست نہ ہوتا تو ان کی روح کے نام ترسیل پیغام کا خیال تک دل میں نہ لاتا اور اس نصیحت کے بارے میں بھی کچھ نہ جانتا جس پر ان کے قریبی رشتہ دار اور دوست ان کی زندگی کے آخری لمحے تک، عمل کرتے رہے۔

یہاں میں نے آپ کو پھر ایک اور سوچ میں الجھا دیا۔ آپ یقیناً اس نصیحت کے بارے میں بھی سب کچھ جاننا چاہتے ہوں گے جس پر ان کے رشتہ دار اور دوست .... ویسے علامہ مرحوم نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میری اس نصیحت کو کبھی عوام پر ظاہر نہ کیا جائے لیکن چونکہ اب ان کی تحریر و تقریر کا ایک ایک لفظ عوام کی ملکیت بن چکا ہے اور

بالخصوص حکومت پاکستان نے ان کے سارے کلام کو اردو میں تومیایا اور انگریزی میں نیشنلائز کیا ہے۔ اس لئے میں بھی رائج الوقت بے احتیاطی اور غیرذمہ داری پر پوری احتیاط اور ذمہ داری سے عمل کرتے ہوئے اس نصیحت کو عوام کے حوالے کرتا ہوں (کہ عوام بھی کیا یاد کریں گے کہ علامہ مرحوم کے کسی رئیس دوست سے پالا پڑا تھا)

ہاں تو صاحبو ——— اس نصیحت کو سنو (جو گوش حقیقت نیوش ہو) علامہ مرحوم نے فرمایا تھا:۔

اے میرے قریبی رشتہ دارو اور گہرے دوستو ——
تم چاہے میرے قریبی یا دور کے رشتہ دار ہو۔ تمھاری مجھ سے کبھی قلمی دوستی تک نہ رہی ہو۔ خواہ تم میری پیدائش سے پہلے مرچکے ہو یا میری موت کے بعد پیدا ہوئے ہو تمھیں یہ نصیحت ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تم انڈر گراونڈ یعنی روپوش رہو۔ خبردار میری زندگی کے دوران میں اپنی دوستی اور رشتہ داری کا ذکر بھول کر بھی زبان و قلم پر نہیں لانا ورنہ پھر یاد رکھو کہ تمھاری ساری قلعی کھول دوں گا اور تم جیتے جی کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔

اس دھمکی آمیز نصیحت یا نصیحت آموز دھمکی پر جب بھی میں غور کرتا ہوں تو مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ علامہ اقبال کے کلام پر اتنا عمل نہیں کیا گیا جتنا کہ اس نصیحت پر۔ چنانچہ مجھے خود ہی دیکھئے۔ جب تک

اقبال زندہ رہے ہیں انڈر گراؤنڈ رہا۔ اقبال میری نظروں کے سامنے بچے سے بڑے ہوئے، زلفِ کمال کے اسیر ہوئے، ساری دنیا میں عزت اور شہرت حاصل کی لیکن میں ـــــــ ان کا جگری دوست سب کچھ دیکھتا رہا اور کبھی کسی کے کان میں سرگوشی تک نہیں کی کہ یہ اقبال جو محمد اقبال سے ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر اقبال سے علامہ اقبال اور علامہ اقبال سے شاعرِ مشرق بن گیا ہے یہ میرا لنگوٹیا یار رہے ہے۔ اقبال ترقی پر ترقی حاصل کرتا رہا اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔ اقبال قوم، ملک اور ملت کے لئے روتا رہا اور میں اقبال پر ہنستا رہا۔ کئی بار بڑے دلچسپ حادثے بھی ہوئے۔ کسی ادبی جلسے اور مشاعرے میں اقبال اور میں اکٹھے شریک ہوئے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ اقبال اور اس کا کوئی لنگوٹیا ایک ساتھ بیٹھے ہیں حتیٰ کہ میں ایک مشاعرے کی صدارت کر رہا تھا۔ اقبال نظم سنانے آئے اور مجھے سلام کر کے نظم پڑھنے کی بالکل اسی طرح اجازت طلب کی۔ جیسے کوئی عام شاعر کسی صدرِ مشاعرہ سے اجازت طلب کرتا ہے۔ لیکن کیا مجال کہ کسی ایک فردِ واحد کو بھی پتہ چلا ہو کہ میں اور اقبال گہرے دوست تو کجا معمولی شناسا بھی ہیں یا نہیں ـــــــ یہ یا تو کچھ میرا ظرف تھا یا پھر اقبال کی پُراسرار طبیعت۔

یہ میرا چشم دید مطالعہ ہے کہ اقبال بچپن ہی سے پُراسرار طبیعت رکھتے تھے۔ وہ کبھی یہ نہیں ظاہر ہونے دیتے تھے کہ وہ اقبال ہیں یا پھر آئندہ چل کر "علامہ اقبال" بننے والے ہیں۔ بچپن میں اگر کوئی شخص انھیں دیکھتا تو شاید یہی اندازہ لگاتا کہ اگر بڑے ہو کر وہ بہت سے بہت ترقی کریں گے تو

اسکول ماسٹر بن کر رہ جائیں گے۔ اقبال اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ مجھے اس میں بڑا لطف آتا ہے کہ کوئی میرے بارے میں غلط رائے قائم کرے۔ (یہ راز کی بات اقبال نے سوائے میرے کسی کو نہیں بتائی ہے) چنانچہ جب اقبال نے وہ مشہور ترانہ لکھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

تو سارے ہندوستان میں بالخصوص ہندوؤں میں بڑی دھوم مچ گئی کہ اقبال ایک خالص ہندوستانی یا ہندی شاعر ہیں۔ ہندوستانی بالخصوص ہندو جب ان کے بارے میں یہ رائے قائم کر چکے تو اقبال دوڑے دوڑے میرے پاس آئے۔ اس دن ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ میری چارپائی پر گر گر کر بس لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا تو بمشکل ہنسی ضبط کر کے بولے۔

"دیکھو ——— آخر وہی ہوا نا ——— جو میں چاہتا تھا یعنی سارے ملک میں ہنگامہ مچ گیا ہے اور ہر ہندوستانی (بالخصوص ہندو) مجھے ہندوستان کا سب سے بڑا قومی شاعر بنانے پر تل گیا ہے۔ اب بتاؤ ——— دوں سارے ملک کو ایک ڈاج ———؟"

میں چونکہ ان کی رنگ رنگیلی طبیعت سے واقف تھا۔ مسکرایا اور بولا۔

"ہاں ہاں ——— کیوں نہیں۔ ورنہ پھر تمھاری اقبالیت میں

بڑی کسر رہ جائے گی۔

انھوں نے کہا:۔

"اچھا تو پھر کل ملک کے سارے اردو اخبارات پڑھنا تو حیران رہ کر رہ جائیے گے۔ دوسرے دن میں نے اردو اخبارات پڑھے تو حیران رہ گیا۔ ہر اخبار کے پہلے صفحے پر جلی حروف میں ایک نظم شائع ہوئی تھی

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

یہ نظم ادھر چھپی اور ادھر غلغلہ مچ گیا۔ ہندو بالخصوص بڑے ناراض ہوئے۔ اب ملک کے سارے اخباروں میں اقبال کے خلاف مضامین اور نظمیں شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ مجھے ایک نظم کے تین مصرعے یاد ہیں جو شاید یہ ہیں

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے جانتا
ہوں مگر ہے گنگا کی سرزمین سے سلوک تیرا مخاصمانہ
تو شاعر ایشیا نہیں ہے تو فخر ہندوستاں نہیں
ہے وغیرہ وغیرہ:۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

یہاں آپ کو تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اقبال کے اور میرے تعلقات کتنے گہرے تھے۔ آپ بالکل یقین نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال نے اپنی قمیص کے بٹن ٹنکوانے سے لے کر حقہ کا

تمبا کو خریدنے تک ہر چھوٹے بڑے معاملے میں مجھی سے مشورے طلب کئے
نہ صرف طلب کئے بلکہ ان پر عمل بھی کرتے رہے

ایک طرف میرے اور اقبال کے تعلقات کا یہ عالم ہے دوسری طرف وہ اصحاب و خواتین ہیں جو سارے ملک میں شور مچاتے پھر رہے ہیں کہ اقبال صرف ان کے گہرے دوست اور قریبی رشتہ دار تھے۔ پتہ نہیں اقبال کے بعد کس برسات میں یہ گہرے دوست اور قریبی رشتہ دار زمین سے اُبل پڑے یا آسمان سے ٹپک پڑے۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں نے انھیں کبھی بھی اقبال کے قریب تک نہیں دیکھا۔ اقبال جب تک زندہ تھے۔ ان میں سے کسی کو میں نے اقبال کی کوٹھی تو دور رہی اس شہر میں بھی نہیں دیکھا جہاں اقبال رہتے تھے۔ کل ہی کی بات ہے کہ ایک تانگے والا اقبال کی قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے آبدیدہ ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہنے لگا۔

"باؤ جی —— ڈاکٹر میرے بڑے گہرے دوست تھے۔ وہ ہر روز مجھ سے باتیں کرتے تھے۔

میں نے پوچھا:۔

"بھئی آخر کیا باتیں کرتے تھے؟"

اس نے کہا

"وہ ہر صبح کچہری جاتے ہوئے مجھ سے پوچھا کرتے تھے بھئی تانگے والے —— کچہری کے چلوگے —— ؟ ہائے ہائے ——

ابھی تک ان کی آواز میرے کانوں میں میرے دل میں اور میری روح میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے"

یہ جگر خراش واقعہ سن کر میرا دل بھی بھر آیا۔ اور میں نے روتے ہوئے تانگے والے کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔

"سچ کہتے ہو میاں تانگے والے ——— اب تک میں یہ سمجھا تھا کہ صرف میں یک و تنہا اقبال کا گہرا دوست ہوں لیکن آج معلوم ہوا کہ میرے علاوہ بھی کوئی اور ان کا انتہائی گہرا دوست تھا

اس تانگے والے کے علاوہ مجھے ایک اور شخص ملا جسے علامہ اقبال سے بڑا قرب حاصل تھا وہ شخص ایک نائی ہے۔ اقبال نے زندگی میں صرف ایک بار اس سے بات کی تھی اور اس ایک ہی بات نے جیسے اس نائی کی دنیا ہی بدل ڈالی ——— وہ نائی جب پہلے دن ان کا شیو کرنے آیا تو اقبال نے اس سے کہا تھا۔

"میاں نائی دیکھو الٹا شیو نہ کرنا

نائی چونک پڑا اور ان کے قدموں پر گر کر کہنے لگا۔

"حضرت۔ آپ نے مجھے کیا لاجواب درس دیا ہے

اب میری توبہ ہے جو آئندہ کبھی الٹا شیو کروں ———

آپ نے مجھے ایک بڑی بری عادت سے نجات دلائی ہے

سچ مچ دنیا کی ساری تباہی کا ذمہ دار الٹا شیو ہے آئندہ کے لئے کان پکڑتا ہوں۔ کبھی دنیا کا الٹا شیو نہ کروں گا۔

وہ دن اور آج کا دن اس تائی نے کبھی کسی کا انٹا شیو نہیں کیا۔

یہ لوگ تھے علامہ اقبال کے گہرے دوست ــــــ رہے وہ اصحاب جو ان کی خانگی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کی شعر گوئی، سخن فہمی، حاضر جوابی، بذلہ سنجی، پُر مغز گفتگو، مثالی رہن سہن اور مضبوط کردار کے قصے سنایا کرتے ہیں مجھے ان پر اس لئے بھروسہ نہیں کہ وہ علامہ اقبال کے بارے میں کم اور اپنے بارے میں زیادہ پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

حال ہی میں ایک ایسے ہی بزرگ سے ملاقات ہوئی تھی جو دوران گفتگو میں اپنے اور اقبال کے تعلقات کا اس طرح ذکر کرتے رہے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا رہا ہے جیسے وہ آگے آگے چل رہے ہیں اور اقبال ان کے جسم کے پیچھے چھپے چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ویسے ہوتا بھی یہی چاہیئے کہ اگر آپ اقبال کے دوست ہیں تو دوستی کی زیادہ نمائش کرنی چاہیئے اقبال کی کم۔

جب تک اقبال زندہ تھے اس وقت تک میں نے اقبال کے کلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ کیونکہ میں اس اصول کا سختی پابند ہوں کہ

"یار کی یاری سے مطلب یار کی شاعری سے کیا"

اقبال کی وفات کے بعد جب ان کی شاعری کا بڑا چرچا ہوا تو میں نے اُن کا کلام پڑھا۔ بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، وغیرہ وغیرہ لیکن مجھے ان کا کلام اتنا پسند نہیں آیا جتنا کہ وہ خود ــــــ ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اقبال

کو عالمگیر شہرت دلانے میں ان کی شاعری کا دخل صفر ہے اور اس کے دوستوں کا صد فیصد۔ اگر اقبال کے گہرے دوست اور قریبی رشتہ دار ان کی موت کے بعد نہ پیدا ہوتے تو شاید اقبال کو وہ شہرت اور عزت نصیب ہی نہ ہوتی جو انھیں آج حاصل ہے۔

اسی لئے میں اپنے ملک اور اپنی قوم کو یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ ہر سال "یوم اقبال" منانے کی بجائے "یوم احباب اقبال" منایا جانا چاہیئے کیونکہ اقبال اپنے دوستوں کے بغیر کچھ نہیں تھے۔

اگر میرا یہ مشورہ قبول کر لیا گیا تو پھر ایک جائز درخواست یہ ہے کہ سب سے پہلے میرا یوم منایا جائے کیونکہ مجھ سے زیادہ اقبال کے قریب کوئی تھا اور نہ کسی کو اتنی گہری دوستی کا فخر حاصل ہے۔

میں اپنی سوانح حیات کے بارے میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ میں علامہ اقبال کی وفات کے ٹھیک دوسرے دن پیدا ہوا۔ اللہ بس باقی ہوس۔

کیا باغ و بہار آدمی تھا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں حیدرآباد دکن کے ایک تجارتی محکمے کمرشل کارپوریشن میں بحیثیت پبلیسٹی افسر نوکر ہوا۔ یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد یہ میری پہلی ملازمت تھی۔ جس دن میں نے اپنے عہدہ کا جائزہ لیا تو مجھے یہ معلوم کرکے ایک کمینی سی خوشی ہوئی کہ میرے تحت چودہ کلرک اور چھ چپراسی میرے احکام کی تعمیل کرنے کے لئے موجود ہیں۔ اس احساس حاکمانہ کے زیر اثر نئے گیبرڈین کے سوٹ میں اکڑتا میں اپنے اجلاس میں داخل ہوا۔ دروازے پر دو چپراسیوں نے جھک کر ادب سے خالص حیدرآبادی

انداز میں مجھے سلام کیا اور میں گردن کو ایک خفیف جھٹکے سے ایک پر رعب سلام جھاڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور اس طرح یکے بعد دیگرے چودہ کے چودہ کلرک آئے۔ سب سے میرا تعارف ہوا۔ اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ اور تیرہ کلرک تو چلے گئے مگر ایک کلرک میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور انتہائی بے تکلفی سے اس نے پوچھا۔

جناب! آپ نواب مہدی یار جنگ کے صاحبزادے تو نہیں ہیں؟

میں نے کہا:۔

جی نہیں میں نوابوں اور جاگیرداروں کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا میں ایک متوسط خاندان کا فرد ہوں

اس نے کہا:۔

مگر آپ میں اور نواب صاحب کے صاحبزادے میں بڑی حیرتناک حد تک مشابہت ہے۔ مگر خیر نواب صاحب بہادر میرے بڑے کرمفرما ہیں —— واہ واہ کیا آدمی، نواب ہونے کے باوجود سیدھی سادھی طبیعت پائی ہے ان سے مل کر بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نواب قدرت نواز جنگ بہادر سے ملاقات ہوئی ہو۔

"آپ کبھی نواب قدرت نواز جنگ بہادر سے ملے ہیں جناب!

مجھے کچھ اُلجھن سی ہونے لگی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

یہ تو خیر میں جانتا ہوں کہ آپ میرے تحت کلرک ہیں لیکن آپ کے ذمہ کیا کام ہے؟ اور آپ کی تنخواہ کیا ہے اور آپ کا نام کیا ہے۔؟

اس نے بڑی بے تکلفی سے میری میز پر سے ۵۵۵ کا ٹین اٹھایا اور ایک سگریٹ جلاتے ہوئے بولا۔

اس فقیر کا نام سید شاہ رفیع الحسن کلیمی ہے۔ ویسے میں درسگاہ حضرت شاہ خاوش کا سجادہ نشین ہوں۔ میرے اس ریاست میں لاکھوں مرید ہیں میں یہ نوکری ملازمت کے جھگڑے میں ہرگز نہ پڑتا لیکن چونکہ آنریبل ڈبلیو گرگسن ریونیو منسٹر مجھے بہت چاہتے ہیں اس لئے ان کے کہنے سننے پر نوکری کر لی ہے۔ فی الحال تو مجھے یہاں سے ایک سو پانچ روپے تنخواہ ملتی ہے اور میں روزانہ یہاں بازار کا بھاؤ لکھا کرتا ہوں ———

اب آپ ہی کہیں یہ تنخواہ میرے شایان شان ہے۔ ماہانہ ایک سو پانچ روپلے کے تو میں سگریٹ پی جاتا ہوں اور یہاں بیٹھ کر یہ لکھنا کہ چاول روپیہ کے پانچ سیر گیہوں روپیہ کے دو سیر لاحول ولاقوۃ ——— لیکن کیا کیا جائے آنریبل گرگسن مجھے کچھ اتنا چاہتے ہیں کہ میں ان کا یہ حکم ٹال نہ سکا۔

اور میں تو اب

اس کے اس شیطان کی آنت اتنے لمبے جملے سے تنگ آ کر میں نے زور سے گھنٹی بجائی چپراسی اندر آیا قبل اس کے کہ میں چپراسی سے کچھ کہوں سید شاہ رفیع الحسن کلیمی نے چپراسی سے کہا۔

اوہ ——— شیخ امام ——— جاؤ بھئی دوڑ کر دو لیمن لے آنا۔
اف فوہ ——— آج کل کیا گرمی ہے صاحب ——— بس جب

دیکھئے جسم کا فشار نکلا جا رہا ہے۔ اللہ میری توبہ —— گرمیاں یوں تو ہر سال آتی ہیں مگر اس سال —— میں نے پھر شیطان کی آنت کاٹ ڈالی اور بولا۔

آپ بڑے بے تکان بولنے والی آدمی ہیں۔ جب سے میں یہ کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کی زبان میں کوئی کاما یا فل اسٹاپ لگے مگر آپ کا دریائے نطق تو پہاڑی دریا ہے۔

کلیمی مسکرانے لگا اور خوشامدی انداز میں بولا

واہ واہ —— دریائے نطق —— کیا بات کہی ہے۔ آپ تو شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

صاحب —— مجھے بھی شاعری سے بڑی رغبت ہے میں بھی حضرت غلام محمد عباس المتخلص بہ عباس کا شاگرد رشید ہوں۔ کلیمی تخلص رکھتا ہوں اور حضرت عباس نارودی کے رنگ میں صوفیانہ غزلیں لکھتا ہوں —— ابھی میں آپ کو اپنی ایک غزل سناؤں گا مگر شرط یہ ہے کہ پہلے آپ اپنی غزل سنائیں۔

مجھے غصہ آنے لگا۔ احساس حاکمانہ نے مجھے یاد دلایا کہ میرے تحت کا ایک کلرک مجھ سے اتنا بے تکلف ہوا جا رہا ہے۔ مجھے بڑی غیرت آئی کہ اگر میرا ایک معمولی کلرک مجھ سے اتنا بے تکلف ہو جائے اور پہلے ہی دن میرا رعب داب ہوا ہو جائے تو کل چپراسیاں بھی میرا کوئی نوٹس

نہ لیں گے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اب کی بار میں کلیمی کو ڈانٹ دوں گا۔ اور کمرے سے نکال دوں گا۔

میرا چہرہ یک بیک غصّہ سے سرخ ہونے لگا۔ لیکن عین اسی وقت چپراسی اما م کشتی میں دو آرنج کے گلاس لئے اندر داخل ہوا میں نے سوچا چپراسی کے سامنے ڈانٹنا مناسب نہیں اس لئے تھوڑا سا توقف کر لوں۔

چپراسی آرنج کا گلاس رکھ کر باہر چلا گیا اور کلیمی نے کہا

لیجئے لیجئے ——— شوق فرمائیے؟

ابھی میں نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا بھی نہ تھا کہ اس نے اپنا گلاس اٹھا کر غٹ غٹ سارے کا سارا چڑھا لیا، میز پر رکھے ہوئے میرے ریشمی رومال سے مونہہ پونچھ کر اور ٹن میں سے ایک اور سگریٹ نکال کر مجھ سے کہنے لگا۔

"اچھا اب اجازت دیجئے۔ میں ذرا بریگیڈیر توفیق کی دعوت سے فارغ ہو آؤں"

(۴۰۴) یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا کیونکہ اس نے آرنج منگوایا تھا اور اس کا بل ادا نہیں کیا تھا۔ اور مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے جیب میں کتنے پیسے ہیں۔ کہیں چپراسی اور آرنج والے کے سامنے مجھے شرمندہ تو نہیں ہونا پڑے گا کہ اتنا بڑا افسر اور جیب سے پہلے ہی دن آرنج کے دو گلاس کے پیسے بھی نہ نکل سکے۔ بڑی بے تابی اور گھبراہٹ میں میں نے اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع

کر دیں۔ کوٹ کے اندر کی جیب سے ایک میلا کچیلا ایک روپے کا نوٹ
نکل آیا اور میرا تنفس اصلی حالت پر آنے لگا۔ چپراسی اندر آیا میں نے بڑی
رعونت سے ایک روپے کا نوٹ اس کی طرف پھینک کر کہا۔

"آرج تم پی لو۔ میں نہیں پینا چاہتا اور وہ خالی گلاس فوراً اٹھا کر
باہر لے جاؤ ——— اور ——— اور سنو ——— سپرنٹنڈنٹ
کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔"

سپرنٹنڈنٹ فوراً ہی آیا۔ میں نے اس کہا۔

"دیکھئے۔ یہ سید شاہ رفیع الحسن کلیمی ———!

میں رک گیا میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ آگے کیا کہوں اور بغیر سوچے
سمجھے میں نے اس سے کہہ دیا۔

میں یہ قطعاً پسند نہیں کرتا کہ کوئی کلرک بغیر کام کے میرے اجلاس
میں آئے اور دفتر کے اوقات کام میں کوئی کلرک دفتر سے باہر نہ جائے"
اس نے کہا۔

"بہت اچھا۔ ابھی ایک نوٹس سرکولیٹ کروا تا ہوں لیکن جناب
میں سید شاہ رفیع الحسن کلیمی کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ میرے
احکام نہیں مانتے"

میں نے کہا۔

"کیوں ——— ؟ کیا وہ ڈائرکٹر جنرل ہے! آپ اس کے
خلاف میرے پاس رپورٹ کر دیجئے۔ اگر وہ ٹھیک سے آفس ڈسپلن کی

پابندی اور کام نہیں کرے گا تو میں اسے نوکری سے الگ کر دوں گا۔
سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔
جناب - اب تک بیسیوں بار رپورٹ پیش کی جا چکی ہے - مگر ہر بار ڈائرکٹر جنرل صاحب نے رپورٹ بغیر ایکشن کے فائل کرا دی
میں نے پوچھا
کیا مطلب - نہیں نہیں - اب ایسا نہیں ہو گا - یہ دفتر ہے۔ بیت المعذورین نہیں ہے - جائیے، سپرنٹنڈنٹ کے چلے جانے کے بعد میں سید شاہ رفیع الحسن کلیمی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کہ یہ آخر کیا چیز ہے ——— ؟ مجھے اس سے شدید نفرت سی ہو گئی - میں اپنے آپ کو اس کا جانی دشمن سمجھنے لگا اور میں اس سے نہ جانے کس بات کا سخت سے سخت انتقام لینا چاہتا تھا۔
دن بھر میں پیچ و تاب اور کلیمی بریگیڈیر توفیق کا لنچ کھاتا رہا۔
دوسرے دن میں کوئی دس بجے دفتر پہونچا - اپنے اجلاس میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کلیمی میرے اجلاس میں بیٹھا ہے اور اخبار پڑھ رہا ہے - میرے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی اور میں نے غصے سے کہا۔
تم نے میری غیر موجودگی میں یہاں بیٹھنے کی جرأت کیسے کی ؟ نکل جاؤ یہاں سے ——— !
کلیمی مسکراتا ہوا اٹھا اور بڑے پرسکون لہجے میں بولا۔

"اُفوہ ـــــ صاحب تو آج بڑے گرم ہیں۔ تشریف رکھئے تشریف رکھئے۔ میں نفرت سے گرجتی آواز میں چیخ پڑا۔

تم کون ہوتے ہو مجھے تشریف رکھنے کی دعوت دینے والے! یہ میرا اجلاس ہے گیٹ آؤٹ فرام ہیر۔! کلیمی کے چہرے پر مسکراہٹ پہلے پہلے کی طرح موجود تھی۔ چہرے پر کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

بعض باتوں پر انسان کو غصہ آہی جاتا ہے، مَیں آپ کے غصے کا برا نہیں مانتا۔ ممکن ہے آپ گھر میں جھگڑا کر کے سیدھے دفتر آرہے ہوں۔ ایسا ہوتا ہے۔ آپ سے پہلے جو پبلیسٹی افسر صاحب تھے وہ بھی اکثر اپنی بیگم صاحبہ سے لڑ جھگڑ کر دفتر آتے تھے

میں پھر چیخ پڑا۔

بکواس نہ کرو۔ یو ایڈیٹ ـــــ فول

میں نے زور سے گھنٹی بجائی۔ شیخ امام چپراسی اندر آیا۔ میں نے اس سے کہا۔

اس شخص کو کمرے سے باہر نکال دو۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ شیخ امام اپنی جگہ پر گم سم کھڑا۔ مجھے چپراسی پر بھی غصہ آگیا میں نے اسے بھی ڈانٹا۔

تم بہرے ہو۔ تمھیں سنائی نہیں دیتا۔ گردن میں ہاتھ دے کر نکال دو اس شخص کو باہر ـــــ! چپراسی نے سر جھکا کر بالکل مری ہوئی

میں نے جواب دیا

حضور ——— میں انھیں کس طرح نکال سکتا ہوں - یہ میرے پیر و مرشد ہیں - میں ان کا ادنیٰ مرید ہوں

میرے غصے کی انتہا نہ رہی - میں بولا

اچھا تو اب میں تمھیں بھی نوکری سے علیحدہ کر دوں گا - یہ کہہ کر میں ایک رپورٹ لکھنے کے لئے اپنا فاؤنٹین پین کھول ہی رہا تھا کہ کلیمی اٹھا اور بولا

صاحب - میں خود ہی جا رہا ہوں - آپ میری خاطر کیوں اس غریب آدمی کے پیٹ پر لات مار رہے ہیں یہ جملہ اس لئے اس طرح سے ادا کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ میرے پیٹ پر تو لات نہیں مار سکتے صرف اس غریب کے پیٹ پر لات مار سکتے ہیں -

کمرے میں کوئی نہ تھا میں نے انتہائی غصے کے عالم میں صرف کلیمی کے خلاف رپورٹ لکھی اور "ارجنٹ" کی سلپ لگا کر ڈائرکٹر جنرل کے پاس بھیج دی -

سہ پہر ہو گئی اور کوئی جواب نہ آیا - اسی اثنا میں چند بیوپاری آئے اور انھوں نے شکایت کی آج کل آپ کے دفتر سے روزمرہ نرخوں کی رپورٹ نہیں آ رہی ہے جس کے باعث ہمیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے میں نے سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا کہ وہ متعلقہ کلرک کو معہ فائل کے میرے پاس بھیجدے -

متعلقہ کلرک کلیمی ہی تھا اور سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ کلیمی صبح سے شہزادی نیلوفر کے محل "ہل فورٹ" گیا ہوا ہے۔ یہ سن کر میرے غصہ کی تاب نہ رہی میں سپرنٹنڈنٹ پر برس پڑا۔

" تو پھر وہ یہاں کلرکی کیوں کرتا ہے ——— ؟ شہزادی نیلوفر سے کہہ کر وہ یہاں کا ڈائرکٹر جنرل کیوں ہو جاتا اور آپ ——— ؟ آپ تو مجھے فضول آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ اپنی پوسٹ کے لئے قطعاً اہل نہیں ہیں آپ ایک کلرک پر کنٹرول نہیں کر سکتے تو چودہ کلرکوں پر کیا کنٹرول رکھ سکتے ہیں۔ جائیے۔

وہ چپ چاپ چلا گیا اور میں نے بیوپاریوں سے ایک شکایتی درخواست لکھوائی اور اس پر کلیمی کے خلاف سخت رپورٹ لکھ کر "ایمیجیٹ" کا سلپ لگا کر ڈائرکٹر جنرل کے پاس بھجدیا۔ چار بجے تک کوئی جواب نہ آیا۔ میں پیچ و تاب کھاتا سگریٹ پیتا گھر چلا گیا۔

تیسرے دن میں ساڑھے نو بجے دفتر پہونچا اور یہ دیکھنے کے لئے کہ کلرک وقت کے کتنے پابند ہوتے ہیں میں نے کلرکوں کے ہال کا معائنہ کیا وہاں ہال میں سپرنٹنڈنٹ اور کلیمی کے سوا کوئی نہ تھا ——— کیا کلیمی وقت کا اتنا پابند ہو گیا ہے۔ میں سمجھا جیسے میری رپورٹوں پر ڈائرکٹر جنرل نے ضرور کوئی کارروائی کی ہے اور کلیمی پر اس کا اچھا اثر پڑا ہے۔ کلیمی نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا مگر میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس فتح کی خوشی میں

میں نے دیر سے آنے والے کلرکوں کو معاف کر دیا۔ انھیں آئندہ سے وقت کی پابندی کرنے کی ہدائت بھی نہیں کی۔ کیونکہ میرا تو صرف ایک ہی دشمن تھا کلیمی۔ باقی بیچارے تو خیر معاش غریب کلرک تھے ان سے میری کیا لڑائی اور دشمنی ہو سکتی ہے۔ !!

ابھی شاید دو ڈھائی بجے تھے کہ میرے پاس ایک رخصت کی درخواست آئی۔ کہ میرے والد اقدس کا عرس کا بتاریخ ۱۳ ار جمادی الثانی مقرر ہے۔ اس لئے تین روز تک دفتر حاضر ہونے سے قاصر ہوں۔ لہذا تین چار روز کی رخصت اتفاقی منظور فرمائی جائے۔

پیرزادہ سید شاہ رفیع الحسن کلیمی عفی عنہ، سجادہ درگاہ حضرت شاہ خاموش۔

یہ رخصت مانگنے کا عجیب طریقہ اس لئے درخواست میں مجھے نہ "عالیجی" اور نہ "بہ کمال ادب استدعا ہے کہ" اور نہ ہی آپ کا وفادار خادم اور پھر رخصت کے دنوں کی کوئی تعداد معین نہیں۔ تین چار روز۔ گویا کوئی مذاق ہو۔ میں نے درخواست نامنظور کر دی اور سپرنٹنڈنٹ کو بھیج دی

دوسرے دن سویرے میں دفتر گیا اور کلیمی کو بلا بھیجا۔ مگر کلیمی نہیں تھا اور سپرنٹنڈنٹ نے مجھے ڈائرکٹر جنرل پر بھی بڑا غصہ آیا۔ میں اسی وقت ان سے ملنا چاہتا تھا مگر وہ آفس تشریف ہی نہیں لائے اور سارا دن نہیں آئے۔

اس کے دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ ڈائرکٹر جنرل صاحب کلیمی کے والد اقدس کے عرس میں شرکت کرنے تشریف لے گئے تھے۔ اور مزید یہ معلوم ہوا کہ کلیمی نے سوائے میرے دفتر کے دوسرے افسروں کو عرس میں شرکت کرنے کی دعوت دی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ میری ہتک تھی۔ میں سوچنے لگا کہ عجیب نوکری ہے یہ۔ جس دن میں نوکر ہوا تھا اس دن سارے خاندان والوں نے ہار پہنائے تھے میری چھ سو روپے ماہوار میں کچھ ایسا جادو تھا کہ ہر کنواری نوجوان لڑکی کا باپ میری طرف خاص طور پر ملتفت تھا۔ میری ہر جگہ آؤ بھگت ہونے لگی تھی۔ والدین کہتے تھے کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے چھ سو روپے ماہوار کی افسری مل گئی ہے مگر جب سے میں نوکر ہوا تھا یہ نوکری مجھے جنجال معلوم ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ایسی افسری سے ہاتھ دھولوں کیونکہ ایک معمولی کلرک کے آگے میری افسری گھٹنوں کے بل گر پڑی دنیا میری افسری سے خوش تھی اور میں دل ہی دل میں رنجیدہ

واہ رے کلیمی کے بچے —— یہ گالی نما جملہ اکثر میرے دل میں گونجا کرتا تھا

کلیمی آٹھ روز تک دفتر نہ آیا۔ اس کا کام مجبوراً سپرنٹنڈنٹ کو کرنا پڑتا تھا کیونکہ بیوپاری میرے اجلاس میں آکر بیٹھ جاتے تھے اور میں مجبور ہو جاتا تھا

نویں روز کلیمی دفتر آیا —— سپرنٹنڈنٹ نے مجھے اطلاع دی اور میں نے قسم کھائی کہ یا آج میں اس دفتر میں رہوں گا یا کلیمی —— اور اسی عہد کے بعد میں ڈائرکٹر جنرل کے پاس

چلا گیا۔ ڈائرکٹر جنرل نے پوچھا

کہو بھئی کیا بات ہے ——

میں نے کہا۔

میں نے ایک کلرک کلیمی کے بارے میں آپ کے پاس کئی رپورٹیں بھیجی ہیں۔ فائل ابھی تک آپ کے پاس پڑی ہے۔ اگر آپ اس پر کوئی ایکشن نہیں لینا چاہتے تو میرا استعفیٰ قبول فرمایئے۔

ڈائرکٹر جنرل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بھئی سنبھال کے کام چلاؤ۔ تم جانتے نہیں ہو کلیمی کون ہے؟ اس کی دور دور تک پہنچ ہے۔ سارے منسٹروں، وزیر اعظم، شہزادوں۔ شہزادیوں اور تو اور اعلیٰ حضرت بندگان عالی تک اس کی پہنچ ہے۔

میں نے پوچھا

تو وہ کلرکی کیوں کرتا ہے —— ؟ کوئی مستحق غریب آدمی اس کی جگہ کام کرسکتا ہے وہ اونچی اونچی بارگاہوں تک پہنچتا رہے مگر کام کا تو ہرج نہیں ہونا چاہیے۔

ڈائرکٹر جنرل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یار میرے۔ تم ایک نوجوان افسر ہو۔ ابھی ابھی کالج سے نکلے ہو تمھیں کیا پتہ۔ دفتر میں کام کم ہوتا ہے اور کام کا چرچا زیادہ۔ چلاؤ۔ جس طرح بھی کام چل رہا ہے۔ چلاؤ —— ہمیں ہر ماہ تنخواہ ملتی ہے۔ تنخواہ لو اور بس اللہ ہو۔

میں نے ڈائرکٹر جنرل کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دوسرا کلیمی معلوم ہو رہا تھا مجھے پہلی ہی نوکری میں یہ پتہ چل گیا کہ جاگیردارانہ دور کے دفاتر کا ہر شخص کلیمی ہے جاگیرداری مشین کا ہر پرزہ بیکار ہے

میں نے اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر میرا استعفےٰ قبول فرمایئے

ڈائرکٹر جنرل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھاتے ہوئے کہا

میرے نوجوان دوست۔ بیٹھ جاؤ۔ اس طرح ناسمجھی کی حرکتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ چھ سو روپے ماہانہ اس عہد میں ملنا بہت مشکل ہے ——

ایک کلرک تمھارے احکام نہیں سنتا تو کیا ہرج ہے باقی تیرہ کلرک تو تمھارے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں

کافی دیر بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کلیمی جیسے نکمے شخص کی خاطر کیوں اپنے چھ سو روپے ماہوار کا نقصان کروں۔ لوٹ کے بازار میں صرف کلیمی ہی کے ہاتھ مصروف رہیں اور میں تماشہ کنارہوں۔ ہٹاؤ کلیمی کے بچے کو——!

میں ڈائرکٹر جنرل کے کمرے سے باہر نکلا۔ کلیمی وہاں کھڑا تھا۔ بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

میں نہ کہتا تھا تم کلیمی کا کچھ بگاڑ سکتے!!

اپنے اجلاس پر آکر بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ آخر مجھے کیا کرنا چاہیئے کہ کلیمی دفتر میں بھی رہے اور اس پر میرا رعب بھی باقی رہے ——

آخر کار میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

میں نے کلیمی کو ایک الگ کمرہ دے دیا اور اس پر ایک چپراسی متعین کرکے پابندی لگا دی کہ چپراسی کلیمی کو بغیر میری اجازت باہر نہ جانے دے میں نے چپراسی بھی وہ مقرر کیا جو اتفاق سے اس کا ریڈ نہیں تھا۔ بڑا دبنگ قسم آدمی تھا جس کے آگے کلیمی کی پیش نہ گئی۔ پہلے پہلے کلیمی مجھ سے اس کی شکایتیں کرتا رہا۔ پھر ڈائرکٹر جنرل سے کی اور پھر آخر کار ایک دن وزیر اعظم کا ایک سفارشی رقعہ ڈائرکٹر جنرل کے نام کہ مسٹر کلیمی پر دفتر میں زیادہ سختی نہ کی جائے۔ جواباً میں نے ڈائرکٹر جنرل کو لکھ دیا کہ اس حکم کی تعمیل کی جائے گی مگر اندرونی طور پر میں نے اپنے سخت رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی ــــــ میں ویسے بظاہر کلیمی پر کوئی سختی نہ کرتا تھا۔ لیکن اب ایک بار جب وہ دفتر سے پورا ایک مہینہ غائب رہا تو میں نے اکاؤنٹس سیکشن کو لکھ کر اس کی پوری تنخواہ کٹوا دی۔ اس سزا کا بھی کلیمی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ یہ آخر کس لالچ میں کلرکی کرتا ہے۔ اس کو تنخواہ کی بھی فکر نہیں ہے۔

لوگ تو روپے کی خاطر ہی کلرکی جیسی ذلیل نوکری قبول کر لیتے ہیں۔ پھر یہ کیا راز ہے؟

میں نے سوچا کچھ دن کے لئے کم از کم اس راز کو حل کرنے کے لئے مجھے کلیمی سے صلح کر لینی چاہیئے۔ اس لئے ایک دن دفتر آتے ہی میں نے کلیمی کو بلا لیا۔ کلیمی آیا۔ میں نے چپراسی کو بھیج کر آفیسرز میس سے دو آئس کریم منگوالیں چھوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کلیمی کو پیش کیا۔ کلیمی

بڑی حیران نگاہوں سے میرے بدلے ہوئے رویے کو دیکھ رہا تھا.

اس کی حیران نگاہیں جیسے بار بار مجھ سے کہہ رہی تھیں ——

—— کہ اگر تم پہلے ہی دن مجھ سے صلح کر لیتے تو شاید اتنی خفتیں نہ اٹھانی پڑتیں ۔

کلیمی نے دن بھر کوئی کام نہیں کیا سارا دن وہ شہزادی درشہوار شہزادی نیلوفر۔ نواب فلاں یار جنگ بہادر۔ نواب فلاں نواز جنگ بہادر کے محلوں کے چکر کاٹتا رہا۔ فلاں کپتان کے ساتھ لنچ کھایا۔ فلاں افسر کے ساتھ بلیرڈ کھیلا اور دفتر ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے وہ اپنی ہیٹ اور سائیکل لینے آیا تو میں نے اس سے کہا۔

"آؤ مسٹر کلیمی آج آپ کے ساتھ کوئی پکچر دیکھی جائے"۔

"جناب پکچر تو نہیں — آپ کو ایک بڑی دلچسپ جگہ لے چلتا ہوں چلئے کازموپالیٹین کلب میں ریڈ کراس فنڈ کے سلسلے میں ڈانس ہے وہاں چلیں گے ۔

وہ مجھے کازموپالیٹین کلب لے گیا۔ وہاں میری حیرت کی انتہا نہ رہی بڑے بڑے انگریز اور امریکن افسر بڑے ادب سے سر جھکا کر اسے سلام کرتے تھے۔ انگریز اور کرسچین لیڈیاں مسکرا مسکرا کر اس سے ملیں اور وہ ان سے میرا تعارف کراتا۔ یہ مس میبل۔ یہ مسز گاربٹ یہ مس دلسن یہ مسز ڈبل ۔ یہ مس مارتھا۔

کلیمی خوش رنگ لڑکیوں کے ہجوم میں کھڑا شاہزادی نیلوفر کا

ایک سموری کالروں والا کوٹ ریڈ کراس کی امداد میں فروخت کر رہا تھا وہ کوٹ کوئی تین چار سو روپے کی مالیت کا تھا۔ مگر چونکہ اسے موسٹ ہولی مسلم پریلیٹ سید رفیع الحسن کلیمی فروخت کر رہا تھا اس لئے ایک خدا رسیدہ بوڑھی میم مسز برنٹ نے پانچ ہزار روپے میں خرید لیا۔

اس کے بعد کلیمی اپنے ساتھ ایک خوبصورت اینگلو انڈین لڑکی مس سارا کو لئے میری ٹیبل پر آیا۔ ہم تینوں بیئر پینے لگے اور کلیمی نے ہلکے سے نشے میں آ کر مجھ سے کہا

"جناب اگر آپ دفتر سے میری چار دن کی غیر حاضری معاف کر دیں تو میں مس سارا کو آپ کے ساتھ بھیجنے کا بندوبست کر دوں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے بڑے پیار آمیز انداز میں ڈانٹ دیا۔

شٹ اپ ——— !!

پھر کلیمی بڑی بڑی ڈینگیں مارنے لگا کہ اب کے "نیو ایر ڈے" پر گورنمنٹ مجھے خان بہادر کا خطاب عطا کرنے والی ہے کیونکہ میں نے اپنے آٹھ سو مریدوں کو اتحادیوں کی فوج میں بھرتی کرایا ہے اور میں بہت جلد یورپ کا اور امریکہ کا سفر کرنے والا ہوں ——— یہ ساری گفتگو وہ اس انداز میں کر رہا تھا کہ جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو کہ جب میں خان بہادر ہو جاؤں گا تو تمھیں اس محکمہ کا ڈائرکٹر جنرل بنا دوں گا اور یورپ یا امریکہ سے میں تمھارے لئے جون کرافورڈ جیسی کوئی خوبصورت لیڈی بطور تحفہ لاؤں گا۔

اب مجھے راز معلوم ہو گیا تھا کہ کلیمی گاڑی کا پایہ جو اس پہیہ ہونے کے باوجود کیوں گاڑی میں لگا ہوا ہے۔ بڑے بڑے منسٹر، افسر اور نواب زادے کیوں اس سے خلوص برتتے ہیں مگر ایک ہونے والا خان بہادر ادنیٰ کلرک کی کرسی پر کیوں بیٹھا ہے؟ یہ بھی تو کوئی ناقابلِ حل راز نہ تھا —— کلرکی در اصل کوئی ذمہ دارانہ پوسٹ نہیں ہوتی۔ یعنی یہ کار آمد بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

انہی دنوں کلیمی کی مخبری کرنے پر میرے محکمے کے ایک کلرک شمس الدین کو پندرہ روپے رشوت لینے کے الزام میں نوکری سے الگ کر دیا گیا اور اس کے دوسرے دن مجھے معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ ایک کانٹریکٹ کے ضمن میں ایک بیوپاری سے چالیس ہزار روپے کلیمی نے وصول کئے جس میں سے بیس ہزار اس نے خود رکھ لئے اور بیس ہزار ڈائرکٹر جنرل کی جیب میں ڈال دیا —— راز اور بھی زیادہ کھلتا جا رہا تھا۔

اب کلیمی اکثر میرے ساتھ رہتا۔ دفتر کے اوقات کے بعد ہم دونوں ایک ساتھ گھومتے پھرتے تھے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں، ناچ گھروں، دعوتوں میں اس کی دوستی میں مجھے بڑے لذت آگیں فائدے پہنچتے رہے۔ مجھے اپنی شکست ایک عجیب و غریب قسم کی فتح محسوس ہوتی تھی۔

ایک دن کلیمی میرے پاس اپنے ایک ساتھی کلرک عبدالرحیم کی شکایت لے آیا۔ عبدالرحیم بہت محنتی کلرک تھا۔ وہ جامعہ عثمانیہ کا فرسٹ کلاس گریجوئٹ بھی تھا۔ لیکن چونکہ کلیمی نہیں تھا اس لئے صرف کلرک کا کلرک تھا۔ کلیمی نے کہا

"عبدالرحیم کو نوکری سے الگ کر دیجئے اور میرے بھانجے سید شاہ مصباح الحسن کلیمی کو اس کی نوکری دیدیجئے۔ میرا بھانجا میٹریکولیٹ ہے" میں نے بسر و چشم اس کے اس حکم کو مان لیا اور ایک محنتی قابل یافتہ کلرک کو جاگیردارانہ سماج کے دوسرے ہزاروں بدقسمت انسانوں کے حلقے میں بھوک اور بیروزگاری سے مرنے کے لئے دھکیل دیا۔ اور اس ناکارہ نااہل میٹریکولیٹ "کلیمی" کو اس کی جگہ بٹھا دیا۔ کیونکہ بقول ڈائرکٹر جنرل کے کام کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کام کم ہونا چاہیئے اور رچیا زیادہ ہونا چاہیئے۔ صرف اونچی اونچی بارگاہوں میں پہنچ ہونی چاہیئے۔

یہ ایک بڑی حد تک تو صحیح ہے کہ کلیمی کی اونچی اونچی بارگاہوں میں پہنچ تھی مگر اس معاملے میں بھی وہ حد درجہ بزدل تھا۔ چنانچہ ایک بار ہم اور وہ عابد روڈ پر سے گزر رہے تھے۔ جب کبھی کوئی بڑی چمکیلی کار سامنے سے آتے دکھائی دیتی تو وہ میرے پیچھے یہ کہتے ہوئے چھپنے کی کوشش کرتا۔

"جناب۔ ماموں آ رہے ہیں ماموں یا چچا آ رہے ہیں چچا۔

گویا ہر بڑی اور چمکیلی اور قیمتی کار میں اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ضرور موجود ہوتا اسی وقت سامنے سے ایک کار آ رہی تھی۔ وہ ماموں یا چچا کہہ کر میرے پیچھے چھپنے لگا اور میں نے دیکھا کہ اس کار میں ایک سکھ کے سوائے کوئی نہ تھا۔

جاگیرداری مشین کا ایک پرزہ ہو کر میں خود بھی اور پرزوں کی طرح ہو گیا تھا۔ اور ہمیشہ کلیمی کی خوشامد کیا کرتا تھا کہ وزیر اعظم یا اعلیٰ حضرت بندگان عالی

سے کہہ کر مجھے کم از کم اس محکمہ کا ڈپٹی ڈائرکٹر بنوا دو۔ کلیمی نے کبھی انکار نہیں کیا ہمیشہ مجھے نصیحت کرتا کہ وقت کا انتظار کرو۔

مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کس وقت انتظار کر رہا ہوں اور کلیمی کس وقت کا انتظار کر رہا ہے ـــــ؟ ایک دن وہ وقت آ گیا۔

میں اس دن دفتر پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں نوکری سے الگ کر دیا گیا ہوں اور میری جگہ سید شاہ رفیع الحسن کلیمی پبلسٹی افسر مقرر ہوا ہے اور اپنے اور میرے درمیان مجھے کہیں کوئی مس تارا کھڑی نظر آتی ہے اور کوئی ہاتھ کسی جیب میں بیس ہزار روپے کے نوٹ ڈال رہا ہے۔

میں سر جھکائے کلرکوں کے ہال میں آیا۔ بارہ کے بارہ کلرک میری طرف دیکھنے لگے۔ کلیمی کا بھانجہ سید شاہ مصباح الحسن کلیمی بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سب سے ہاتھ ملائے اور ایک الوداعی تقریر کے انداز بولنے لگا۔

ساتھیو۔ کیوں اتنی محنت کرتے ہو۔ بہت ترقی کرو گے تو کلرک سے ہیڈ کلرک بن جاؤ گے دوسرے راستے کیوں اختیار کرتے۔ کلیمی کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتے۔

دفتر سے باہر نکلا۔ ایک دوکان پر سگریٹ لینے گیا تو مجھے پرانا کلرک عبدالرحیم ملا جو جامعہ عثمانیہ کا فرسٹ کلاس گریجویٹ تھا اور بہت ہی محنتی کلرک جسے میں نے بغیر کسی وجہ کے نوکری سے

الگ کر دیا تھا۔ میں اس سے نظریں بچانا چاہتا تھا مگر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔ جاگیردارانہ سماج میں سید شاہ رفیع الحسن کلیمی زیادہ اور انسان کم پیدا ہوتے ہیں۔ آؤ چائے پئیں۔!!

دس روپے پندرہ نمبر اور ابراہیم حلبیں

پرسوں کی بات ہے۔ خدا خدا کر کے رات کے بارہ بجے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ اب میرے لئے میدان صاف تھا یعنی ہوٹل کا سیٹھ اپنے گھر چلا گیا ہوگا، چوکیدار اور بیروں کا کوئی فکر نہیں۔ وہ مجھے کافی شریف اور اچھا آدمی سمجھتے ہیں وہ نہ کبھی مجھ سے بل کا تقاضا کرتے ہیں اور نہ کبھی میری بے عزتی کرتے ہیں۔ البتہ سیٹھ ——— سیٹھ کیا ہوتا ہے وہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ خدا کے لئے زبان نہ کھلوائیے تو بہتر ہے۔

میں بڑے اطمینان سے ہوٹل پہنچا۔ ابھی ہوٹل کی پہلی سیڑھی پر قدم

رکھا ہی تھا کہ خلاف توقع اوپر سے سیٹھ کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"ادے کریم بخش ـــــ ابھی وہ پندرہ نمبر والا
نہیں آیا۔ وہ روز اسی طرح کرتا ہے۔ صبح میرے آنے
سے غائب ہو جاتا ہے اور رات کو میرے جانے کے بعد
چوروں کی طرح آتا ہے ـــــ آج اگر وہ
آئے تو اس سے پہلے بل وصول کرنا ورنہ ہوٹل میں
گھسنے نہ دینا۔"

یہ سنتے ہی سیڑھی پر رکھا ہوا پہلا قدم پھر واپس زمین پر آ گیا۔ ابھی کچھ سوچنے اور فیصلہ کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ سیڑھیوں پر سیٹھ کے بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یا الٰہی۔ سیٹھ اسی طرف آ رہا ہے ـــــ! ایک لمحے کے لئے میرے دل کی دھڑکن رکی۔ اور دوسرے لمحے میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹرک پر چلا رہا تھا۔ جب میں کافی دور نکل گیا تو ابراہیم جلیس نے مجھ سے پوچھا

"ارے بھئی پندرہ نمبر! سنو تو۔ کہاں جا رہے ہو اب؟"
میرے قدم رک گئے۔ اپنے ماتھے سے خجالت کا پسینہ پونچھتے ہوئے ایک
کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ میں نے ابراہیم جلیس کو جواب دیا۔
"ارے بھئی۔ تم نے بڑے وقت پر مجھے ٹوکا۔ یہ تو میں
نے سوچا ہی نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں ـــــ! بات
دراصل یہ ہے کہ اردو شاعروں اور ادیبوں نے میرا دماغ

یہ کہہ کہہ کر خراب کر دیا ہے کہ وہی مسافر سچا مسافر ہے
جس کے راستے کی کوئی منزل نہ ہو۔
اچھا خیر تم اب بتاؤ۔ اب کہاں جانا چاہیئے۔؟
ابراہیم جلیس نے جواب دیا۔ تم ہی بتاؤ۔ میرا دماغ اس وقت کام
نہیں کرتا۔
میں نے کہا
" میں نے کہا۔
میں تو پندرہ نمبر ہوں۔ مجھے تو کوئی نہیں جانتا۔ تم البتہ بڑے مشہور
ادیب ہو۔ تمھارے ہزاروں قدرداں ہیں۔ ہزاروں دوست ہیں تم
ہی کچھ بتاؤ۔ ہمارا تو ایک ہی کمرہ تھا۔ اب تو اس میں بھی گھسنے نہیں
دیا جائے گا ——!
ابراہیم جلیس نے کہا
یار پندرہ نمبر —— یہ صحیح ہے کہ میرے ہزاروں
قدردان اور دوست ہیں لیکن وہ سب کے سب
بھی تمھاری طرح "پندرہ نمبر" ہی ہیں۔ آج مجھے احساس
ہوتا ہے کہ میں "عوامی ادیب" ہونے کی بجائے درباری ادیب
ہوتا تو میرے جگری دوست میرے ہمزاد ہماری یہ بے عزتی
کبھی نہ ہوتی۔ نہ جانے ہمارے ملک کا اقتصادی نظام
کب ٹھیک ہوگا ——!"

"یار۔ تم کبھی ایسی بات بھی تو کیا کرو جو کسی مسئلہ کا فوری حل پیش کر سکے مجھے اس وقت دس روپے کی ضرورت ہے اور تم ہو کر سارے ملک کے اقتصادی نظام کو ٹھیک کرنے کی فکر کرنے لگے۔ جب تک سارے ملک کا اقتصادی نظام ٹھیک ہوگا۔ اس سے کئی برس پہلے یعنی کل ہمارا اثاثہ نیلام ہو جائے گا۔

ابراہیم جلیس بھی عجیب خبطی ہے۔ سامنے ایک عالیشان بنک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھو مسٹر پندرہ نمبر اس بنک میں کروڑوں روپیہ پڑا ہوا ہے لیکن ہماری جیب میں پائی نہیں۔

ہائے ہائے ——— خدا بھی کتنا بے انصاف ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

میں جھلا گیا اور بولا۔

"او مخبوط الحواس ابراہیم جلیس۔ میری طرف دیکھو۔ کوئٹہ کی برفیلی ہواؤں میں میرا نحیف و نزار جسم کپکپا رہا ہے۔ اور سامنے ایک لمبی ٹھنڈی رات ہے۔ تم اگر اسی طرح اشعار پڑھتے رہے تو ٹھٹھر ٹھٹھر کر میں یہیں انا للہ و انا الیہ راجعون ہو جاؤں ——— دیکھو یا تو ابھی کہیں سے دس روپے کا بندوبست کرو ورنہ پھر اپنے کسی

دوست یا عقیدت مند کا دروازہ کھٹکھٹاؤ تاکہ رات تو کسی طرح گذر جائے۔"

ابراہیم جلیس شش و پنج میں پڑ گیا اور بولا۔

" یار کس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں ـــــ میرے دوستوں کی اکثریت ایسی ہے۔ جن کا کوئی گھر نہیں اور اقلیت ایسی جن کے پاس ایک ایک کمرے کا گھر ہے۔ جن میں وہ اپنے بیوی بچوں اور والدین کے ساتھ سوتے ہیں ـــــ"

میرے غصے کا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے کہا۔

اقلیت اور اکثریت کی ایسی تیسی ـــــ! اگر تم کوئی بندوبست نہیں کر سکتے تو پھر میں "نئی جبی" جا رہا ہوں"

ابراہیم جلیس نے خوش ہو کر پوچھا۔

اچھا ـــــ نئی جبی میں تمھارے دوست کا کوئی مکان ہے؟

میں نے کہا

ہاں وہاں میرا دوست عزرائیل رہتا ہے ـــــ

ارے بدھو۔ نئی جبی کیماڑی کے راستے میں وہ پل ہے جس پر سے چھلانگ لگا کر مہاجرین خودکشی کرتے ہیں اور دوسرے روز انصار افسوس کرتے ہیں۔"

ابراہیم جلیس سہم گیا اور بولا

ارے نہیں بھائی پندرہ نمبر ـــــ اتنی جلدی ہمت نہ

ہارو ۔ یہ حرام موت ہے"

میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا ۔

اور ہم جو زندگی بحالت موجودہ گزار رہے ہیں وہ بڑی حلال زندگی ہے میں ایسی حلال زندگی پر حرام موت کو ہزار درجہ ترجیح دیتا ہوں ــــ لو بھئی ــــ میں تو چلا ــــ

ابراہیم جلیس گھبرا گیا ۔ اس نے میری ہاتھ پکڑ لی اور گڑ گڑا کر بولا

یار پندرہ نمبر ــــ خدا کے لئے ایسا نہ کرو ۔ دیکھو تمھاری زندگی سے میری زندگی وابستہ ہے ۔ تمھاری موت میں میری موت پوشیدہ ہے میں ابھی مرنا نہیں چاہتا ۔ ہم نوجوان ہیں ۔ ہمیں ہمت سے بُری زندگی کا بڑی بہادری سے مقابلہ کرنا چاہئے ۔ میں تمھیں اب دنیا کے ان بڑے بڑے انسانوں کی سوانحعمریاں بتاؤں گا جنھوں نے لاکھوں مصیبتوں میں کبھی زندگی کا دامن نہ چھوڑا کیا تم نے کارل مارکس کا واقعہ سنا ہے ۔ ؟

مجھے بڑا غصہ آیا ۔

شٹ اپ ۔ بکواس بند کرو ۔ اس وقت یا تو تم دس روپوں کا بندوبست کر دو یا پھر رات گزارنے کا کوئی انتظام ــــ !

ورنہ میری ہاتھ چھوڑ دو میں نٹی جبی چلا ــــ میں اس وقت صبر ایوب علیہ السلام کی کہانی یا کارل مارکس کی سوانحعمری

سلنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوں۔ میرا "موڈ آف" ہے
ابراہیم جلیس کو بھی غصہ آ گیا اس نے گرج کر کہا
ابے الو کے پٹھے پندرہ نمبر ـــــ تیرے موڈ کی ایسی تیسی۔!
مجھ سے نخرے کر رہا ہے۔ بول۔ کہاں سے لاؤں دس روپے؟
تیرے باپ نے کوئی جاگیر چھوڑی ہے۔ یا پھر تیرے خسر
نے یہاں کوئی سرائے کھول رکھی ہے جو تیری میت کا انتظام
کردں ـــــ جا ـــــ تو نئی جیٹی جاتا ہے تو جا ـــــ
میری بلا سے ـــــ مجھے کیا دھونس دے رہا ہے! میں روتا ہوا
نئی جیٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابراہیم جلیس بھی میرے پیچھے چلنے لگا اور
بولنے لگا۔

"اچھا ـــــ چل میں بھی دیکھوں تو کس طرح خودکشی کرتا
ہے خودکشی کا عملی مشاہدہ ہی ہو جائے تاکہ میں خودکشی
پر کوئی کتاب لکھوں"۔

خودکشی کرلنے کے لئے صاحب بڑے دل گردے کی ضرورت ہے
یہ مسٹر پندرہ نمبر میں اتنی جرأت کہاں؟ آخر وہی ہوا جس کی توقع تھی۔
یعنی اس ملک کے تمام خانماں برباد ننگھرے ندرے لوگوں کی
طرح خانۂ خدا یعنی دی نیو میمن مسجد میں گھسا اور لیٹ گیا۔ میں بھی اس
کے ساتھ ہی لیٹ گیا
صبح فجر کی نماز کے وقت ہم دونوں کو مسجد سے باہر نکال دیا گیا۔

مسٹر پندرہ نمبر جاڑے کے مارے کپکپا رہا تھا۔ اسے ہلکا سا بخار بھی ہو گیا تھا۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔

"اچھا مسٹر پندرہ نمبر گھبراؤ نہیں۔ میں آج دن بھر میں کسی نہ کسی طرح دس روپے کا بندوبست کر دوں گا۔ میرے اتنے دوست اور عقیدت مند ہیں آخر کوئی نہ کوئی تو دیدیگا۔ دس روپوں کی کیا بات ؟

میں نے کہا

تو پھر آؤ چلو ——

ابراہیم جلیس نے کہا

"ارے بھائی عقل سے معذور —— ابھی تو سویرا ہوا ہے ابھی تو لوگ سوتے پڑے ہیں ذرا کچھ دیر اور ہو جانے دو پیر الہٰی بخش کالونی چلیں گے وہاں بہت سے دوست ہیں"

میں نے جواب دیا

ہماری جیب میں ایک پائی نہیں۔ اس وقت ہم بولٹن مارکیٹ پر کھڑے ہیں۔ پیر الہٰی بخش کالونی یہاں سے چار میل دور ہے ہم وہاں پہنچتے پہنچتے تو تمھارے دوست شاید دوپہر کا کھانا کھا رہے ہوں گے۔

صبح چھ بجے بولٹن مارکیٹ سے روانہ ہو کر دس بجے ہم دونوں یار پیر الہٰی بخش کالونی پہنچے ایک دوست سے ملے ابراہیم جلیس

نے بڑے گھگھیاتے اور شرماتے ہوئے بڑی ہمت کر کے کہہ دیا

"یار ہمیں دس روپے چاہئیں"

دوست نے کہا۔

"صرف دس روپے -؟ یار تم پندرہ منٹ پہلے آتے تو میں دس کیا بیس دیدیتا۔ ابھی ابھی میں نے دھوبی کو بیس روپے دیدیئے ہیں۔ کل اگر تم آؤ تو میں ضرور دے دوں گا۔ کل اسی وقت بھولنا نہیں"!

پندرہ نمبر کی صورت اتر گئی اور ابراہیم جلیس نے کہا

"یہ ہرگز نہیں بھولیں گے۔

ہمیں تو فرصت نہیں۔ البتہ ہم کل ٹھیک اس وقت اپنی روح کو آپ کے پاس بھیج دیں گے اسے دیدیجئے۔ سمجھے؟"

دوست جھینپنے کی بجائے بے حیائی سے ہنس کر بولے اور بھئی خوب مذاق کیا — آخر ہونا بڑے پایہ کے اہل قلم -!

اچھا بھئی چلد ہیئے۔ خدا حافظ"

اس کے ہم چودہ دوستوں سے ملے اور سب سے مل کر یہی معلوم ہوا کہ ہم پندرہ منٹ دیر سے پہنچے ہیں۔ جانے یہ دھوبی، مالک مکان، اخبار والے دکاندار، قرضدار اتنے وقت کے پابند کیسے ہو گئے کہ ہم سے ٹھیک پندرہ منٹ پہلے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔

اب صرف بمبئی بازار میں ایک دوست رہ گیا تھا۔ اور اس کے بعد

نئی جبتی آخری دوست

تھکے تھکے قدم اٹھائے پیر الٰہی بخش کالونی سے بمبئی بازار لوٹ رہا تھا کہ پیچھے سے ایک شاندار بیوک کار ہمارے قریب رُکی۔ ایک بہت سرمایہ دار جو ابراہیم جلیس کے بڑے پرستار تھے۔ کار سے نکلے اور انھوں نے پوچھا

"کہاں جا رہے ہو بھئی جلیس ــــ آؤ میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔"

ابراہیم جلیس نے کہا۔

"کہیں نہیں۔ ہمارا کوئی پروگرام نہیں

مالک بیوک نے کہا

اچھا تو آؤ میں تمھیں ہوٹل میٹرو پول میں لنچ کھلاؤں بیٹھ جاؤ"

ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں نے چپکے سے جلیس کی چٹکی لی اور سرگوشی میں کہا۔

"لو ــــ کام بن گیا یہ شخص ہمیں دس روپے کیا سو روپے بھی دے سکتا ہے۔"

ہم میٹرو پول میں لنچ کھانے لگے۔ بل ادا کرتے وقت مالک بیوک نے جیب سے سو سو روپے کی بہت موٹی سی گڈی نکالی۔ بل ادا کیا۔ اور گویا ہمیں ایک تھپڑ کھینچ مارا یعنی اس نے بیرے کو دس روپے ٹپ دیدیا

میں نے جلیس سے پھر سرگوشیانہ لہجے میں کہا

جو شخص دس روپے۔ بیرے کو ٹپ دے سکتا ہے......

شاید یہ سرگوشی مالک بیوک نے سن لی بولا۔

بھائی بھائی۔ یہ بیرے غریب لوگ ہوتے ہیں چھوٹی تنخواہ میں
ان کا گزارا نہیں ہوتا۔ اس لئے دینا ہی پڑتا ہے۔!
میں نے اس سے پوچھا
بیرے غریب آدمی ہوتے ہیں۔ بھلا ہم لوگ کون ہیں؟
مالک بیوک نے جھینپ کر کہا۔
ارے بھائی۔ آپ لوگوں کو تو خدا نے قلم کی اور دماغ کی
دولت دی ہے۔ آپ کے سامنے تو ہم بھی غریب ہیں ــــ اچھا
اب بتائیے آپ کو کہاں چھوڑ دوں ــــ؟
ابراہیم جلیس نے کہا۔
میکلوڈ روڈ پر
ہم کار میں بیٹھ گئے کار چلی میں جلیس کا ہاتھ دبا رہا تھا۔ کہ بول۔
عرض مدعا کر لے۔ مانگ لے۔ کچھ مانگ لے۔
جلیس نے مالک بیوک سے کہا۔
"دیکھئے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔
مالک بیوک نے کہا۔
ہاں بھئی کہو ــــ کیا کہنا چاہتے ہو ــــ؟
جلیس نے بڑی کوشش کی اور پھر بولا
میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ جہاں اتنا مال و دولت رکھتے ہیں
وہاں پاکستان کے غریب آدمیوں کے لئے بھی کچھ کیجیے۔

اُن کے لئے مکان بنوا لیجئے۔ اُن کے روزگار کا بندوبست کیجئے ان کے لئے اسکول کھولئے۔"

مالک بیوک نے کہا۔

"ضرور۔ ضرور۔ میں نے اس سلسلے میں گورنمنٹ سے بات کی ہے۔ وہ ہو جائے گا۔"

میکلوڈ روڈ آ گئی۔ اس نے پوچھا

یہاں اتار دوں ——؟

جلبیس نے کہا۔

"ہاں۔ یہاں بس ٹھیک ہے شکریہ آپ کا"

ہم دونوں کار سے اتر گئے میں نے بڑے غصے سے جلبیس کا ہاتھ ایک بار اور دبایا۔ جلبیس نے تڑپ کر ان سے کہا

"اچھا ایک بات اور سنئے۔ وہ یہ ہے کہ میرا ایک دوست بیچارہ غریب آدمی ہے اُس کو دس روپوں کی اشد ضرورت ہے۔ اگر آپ اسے دس روپے دے دیں تو میں ممنون ہوں گا۔"

مالک بیوک نے کہا

اوہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ آپ آج ہی شام اس غریب آدمی کو میری کوٹھی پر بھیج دیجئے۔ دس کی کیا بات ہے میں پچاس روپے دے دوں گا۔ آپ سفارش کریں اور میں انکار کر دوں۔ بھلا یہ کہیں ہو سکتا ہے ——!

اچھا خدا حافظ!

مالک بیوک موٹر سٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ میرا غصہ کے مارے برا حال ہو گیا۔ میں نے جلیس کے سر کے بال نوچ لئے اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور روتا ہوا نئی جمبی کی طرف بھاگا۔

اس کے بعد کیا ہوا یہ معلوم نہیں۔ اب میں دوزخ میں ہوں۔ یہاں جو اطلاعات مجھے ملی ہیں وہ یہ ہیں کہ ہوٹل کے سیٹھ نے میری خودکشی پر شکرانے کی نماز پڑھی اور ابراہیم جلیس نے میری وفات حسرت آیات پر ایک دردناک مضمون لکھ کر پچاس روپے معاوضہ حاصل کیا۔ اور نیلام گھر سے اپنے دوست کی نشانی یعنی میرا اثاثہ اونے پونے خرید لیا۔

اب اس سالے۔ ہوٹل میں میرے ہی کمرے پر قبضہ جما رکھا ہے میرے ہی بستر پر سوتا ہے۔ میرا ہی مارننگ گاؤن پہن کر اینڈتا ہے۔ میرا ہی اکلوتا سوٹ پہن کر گھومتا پھرتا ہے۔ حد ہو گئی۔

کمینہ کہیں کا —— آخر کبھی نہ کبھی تو وہ آئے گا دوزخ میں جب دیکھ لوں گا اس دوست نما دشمن کو —— !!

کالے چور کے نام

میرے پیارے کالے

سلام مبہوت!

معاف کرنا سلام محبت کے بجائے سلام مبہوت اس لئے عرض خدمت ہے کہ آج کل میں تم سے بہت ہیبت زدہ ہوں۔ تم شاید۔ شاید کیا یقیناً۔ مجھے نہیں جانتے اور میں بھی تم سے واقف نہیں ہوں۔ اس دو طرفہ ناواقفیت کے باوجود میں تمھیں خط لکھنے پر اس لئے مجبور ہوں کہ آج کل تم نے میرا چین و آرام حرام کر رکھا ہے تم بھلا کیسے بھول سکتے ہو

کہ تم آج سے ٹھیک آٹھ برس پہلے رات کے دو ڈھائی بجے میرے پڑوسی کے گھر آئے تھے ——— اور پڑوسی نے معہ اپنی بیوی اور دو نوجوان سالیوں کے چیخ چیخ کر سارے محلے کو جگا دیا تھا۔ ڈرا دیا تھا۔ اور دم بخود بنا ڈالا تھا۔ تم اس کے گھر سے چاندی اور سونا اور میرے گھر سے رات کا سونا چرالے گئے تھے ——— یقین جانو وہ رات اور پھر آج کی رات مجھے ایک رات بھی چین کی نیند نہ آئی۔ ساری ساری رات جاگتا رہتا ہوں۔ ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتا ہوں کہ تم آ گئے ——— ! لیکن ابھی تک تمھاری بجائے ایک بلی آتی رہی ہے۔ کبھی ذرا آنکھ جھپک جاتی ہے تو تم خواب میں آ دھمکتے ہو۔ بتاؤ میرے نادیدہ دوست، میرے ساتھ آخر یہ آنکھ مچولی کیوں کھیل رہے ہو؟

ظاہر ہے کہ تم میرے اس سوال کا جواب نہیں دو گے؟ سوال کا جواب ہی کیا نہ تو یہ خط تم تک پہونچ سکے گا۔ اور نہ یہ خط تم کبھی پڑھ سکو گے اگر تمھیں سوال کا جواب دینا یا خط پڑھنا آتا تو تم چوری کیوں کرتے؟ چور کیوں بنتے؟ میری طرح فری لانس جرنلزم کرتے یا پھر ترقی پسند افسانہ نگار بن جاتے! اس مقام پر تمھاری بجائے کوئی شخص بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب یہ خط نہ تو مکتوب الیہ پڑھ سکتا ہے اور نہ اس پہنچ سکتا ہے تو مجھے لکھنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی ——— ؟ اس کا جواب میرے پاس سوائے اس کے کیا ہے کہ یہ ایک "کھلا خط" ہے اور کھلے خطوط بالعموم کسی جواب کے لئے نہیں لکھے جاتے بلکہ صرف دل کی بھڑاس نکالنے کے

سپرد قلم کیے جاتے ہیں چنانچہ میں بھی یہی کچھ کر رہا ہوں
اس خط کو تحریر کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہارے انتظار میں جمائیاں لے لے کر جاگنے کے بجائے میں تمہارے بارے میں کچھ لکھ کر اپنے آپ کو فن چوری سے واقف کراؤں کیونکہ یہ فن عرصۂ دراز سے تحقیق یا ریسرچ کا محتاج رہا ہے اس سے یہ تو فائدہ ہو گا کہ کم از کم آج کی رات مجھے جاگتا اور لکھتا دیکھ کر تم میرے گھر آنے کی جرأت نہیں کرو گے۔
میرے گھر تمہاری تشریف آوری کا خدشہ تو اسی دن پیدا ہو گیا تھا جس دن تم نے میرے پڑوسی کے گھر چوری کی تھی مگر اس خدشہ میں شدت اس دن سے پیدا ہوئی جس دن کسی نے میرے بھونکنے والے کتے کو زہر دے کر مار ڈالا۔ ظاہر ہے کہ کوئی چور ہی کتے کو ہلاک کر سکتا ہے۔ کیونکہ چور اور کتے میں کچھ ایسی ہی جانی دشمنی ہوتی ہے جتنی کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں۔ چور کتے کو اور کتا چور کو ایک لمحے کے لئے برداشت نہیں کر سکتا چور چاہتا ہے کہ کتا بھونکنا چھوڑ دے اور کتا چاہتا ہے کہ چور چوری چھوڑ دے اب حقیقت تو یہ کہتی ہے کہ دونوں ہی دونوں چیزیں نہیں چھوڑ سکتے۔ کتا اگر بھونکنا چھوڑ دے تو کتا ہی باقی نہ رہے اور چور چوری چھوڑ دے تو صاحب جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ اور چور کے بارے میں تو یہ بھی مشہور ہے۔ کہ چور چوری چھوڑ دے گا مگر ہیرا پھیری نہیں چھوڑے۔ فی الوقت مجھے ہیرا پھیری سے کوئی غرض نہیں اس لئے کہ تم نے ابھی شروع ہی نہیں کی ہے۔ لہذا میں اس خط کو صرف تمہاری

چوری یا تمھارے چور ہونے کے موضوع تک

ہاں تو تم نے میرا کتا اس لئے مار ڈالا کہ جب تم میرے گھر قدم رنجہ فرماؤ تو وہ نہ بھونکے اور تم اس اطمینان سے اندر آ جاؤ جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر ہندوستان آ گئے تھے۔ لیکن محض کتا مارنے سے کیا ہوتا ہے جبکہ تم نے میرے پڑوسی کے گھر میں کتے پن کی حرکت کر کے مجھے ہمیشہ کے لئے چوکنا کر دیا ہے۔ اور پھر ایک کتے کے مر جانے سے کیا ہوتا ہے ایک کے بدلے دس کتے مل سکتے ہیں اور بالکل مفت مل سکتے ہیں جہاں تک میری مویشی معلومات کا تعلق ہے کتا گھوڑے خچر، گائے، بیل کی طرح "قیمتی" نہیں ہے۔ (انگلستان اور امریکہ اس بیان سے مستثنیٰ ہیں۔

یہاں کسی بین الاقوامی کتے پر بات کرنے سے قبل میں پھر تمھاری طرف متوجہ ہو جانا چاہتا ہوں اور تمھاری غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ تمھیں میرے گھر سے سونا چاندی یا روپیہ ملے گا۔ ویسے تم آدھی رات کو بھی میرے گھر آ سکتے ہو۔ میرے گھر میں کتابوں اور کپڑوں سے سوائے تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ کتابیں تو خیر تمھارے کام کی چیزیں نہیں ہیں رہے کپڑے —! وہ تم لے جا سکتے ہو اور لے جا کر چھپا بھی سکتے ہو کیونکہ ایک پتلون ایک بش شرٹ اور ایک کوٹ بھی تمھارے کام نہ آئے گا۔ یہ سب کپڑے ایک بار سلوائے گئے اور بار بار رفو کرائے گئے ہیں رفو شدہ پھٹے پرانے کپڑے اردو زبان کے ادیبوں کو تو زیب دیتے

ہیں مگر تم جیسے چوروں کے شایانِ شان نہیں ورنہ پھر چور میں اور بھکاری میں کیا فرق رہے گا ۔ چور تو بھکاری سے زیادہ معزز اور بلند آدمی ہوتا ہے عقلمند لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ جو آدمی بھیک نہیں مانگ سکتا وہ چوری کرتا ہے ۔ اب یہ بات بالکلیہ نفس موضوع سے متعلق ہے کہ بعض فقیر چور ہوتے ہیں

میرا جہاں تک خیال ہے تمھیں تمھارے مخبر نے غلط باور کرایا ہے کہ میرے پاس کچھ ایسا مال واسباب ہے جو چوری بھی ہو سکتا ہے ۔ کاش کہ ایسا ہوتا افسوس ایسا نہیں ہے ۔ بلکہ بعض اوقات تو یقین جانو رات کے کھانے اور صبح کی چائے تک کے لئے پیسے نہیں ہوتے میں تمھیں اپنے گھر آنے سے روکنے کے لئے ایسی چکنی چپڑی باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ سنگین حقائق کا اظہار کر رہا ہوں ۔ تم کبھی بھی اپنے مقررہ وقت (یعنی آدھی رات کو بھی) میرے گھر آکر چشم دید قسم کا تجربہ کر سکتے ہو ۔ میری طرف سے تمھیں یہ دعوت اس لئے دی جا رہی ہے کہ بھائی میرے یہ زمانہ ہی کچھ "آنکھوں دیکھا حال" براڈکاسٹ کرنے کا ہے ۔ تم نے ریڈیو پاکستان تو ضرور سنتا ہو گا !!

اس کے بعد بھی تم آؤ گے اور ہنگر پر سے ایک لمبا بش شرٹ اور گھسی ہوئی پتلون لے جاؤ گے تو نہ صرف ڈرائی کلیننگ، معمولی دھلوائی اور رفوگری کے اخراجات تمھیں برداشت کرنے پڑیں گے ۔ بلکہ تمھارے ساتھی چور تمھارا مذاق اڑائیں گے کہ واہ بیٹا واہ کیا ڈاکہ لایا ہے !

اب رہی کتابیں ـــــ یعنی برنرڈ شا کے ڈرامے، ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے ناول، موپساں کے افسانے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظمیں، میتھو آرنلڈ کی تنقیدیں۔ اسٹیفن لیکاک کے طویل و مختصر لطیفے، داغ کی غزلیں، مرزا شوق کی مثنویاں، جان صاحب کی ریختیاں، غالب کے خطوط، ہیلتھ اینڈ ایفیشنسی کے رسالے ان میں سوائے ہیلتھ اینڈ ایفیشنسی کے رسالوں کے تمہارے کام کی کوئی چیز نہیں ہے بھلا ان کتابوں نے مجھے کیا بنایا ہے جو تمھیں بنا دیں گی بلکہ مقام شکر ہے کہ تم کتابیں پڑھنے کی بجائے چوری کرتے ہو۔ چوری کرکے پکڑے جانے تک کے عرصے میں تم زندگی کی موج تو اڑا سکتے ہو اور یہاں یہ حال ہے کہ زندگی ایک ساکن سمندر ہے۔ جس میں کوئی موج نہیں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ باتیں اس خط میں تحریر کرنے کے بجائے میں تم سے بالمشافہ یعنی دو بدو کرتا تم مجھ سے پوچھ بیٹھتے کہ

جب تمہارے پاس کچھ نہیں ہے تو پھر تم مجھ سے ڈرتے کیوں ہو؟

برادرم ـــــ یہ ڈر ہی تو وہ وجہ ہے جس نے مجھے تمھیں ایک کھلا خط لکھنے پر مجبور کیا ہے تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے چوری کے پیشے کو اب اتنا ذلیل کر دیا ہے کہ جب کسی سے تمھیں کچھ نہیں ملتا تو تم اسے جان سے مار ڈالتے ہو بس یہی ایک بات ہے جس کے باعث تمہارے نام ہی سے میری روح فنا ہوئی جا رہی ہے۔ مجھے قلم چلانے

کے علاوہ بندوق چلانا، تلوار پھرانا اور لٹھ گھمانا آتا تو پھر ڈر کی کوئی بات نہیں تھی تمہاری تشریف آوری پر تمہاری ایسی خاطر کرتا کہ تم جیل کے ہسپتال میں رجوع کرا دیئے جاتے مگر کیا کروں آبا و اجداد کا پیشہ صرف سو پشت تک سپہگری رہا اس کے بعد جب سے انگریز آئے آیندہ سو پشت کے لئے پیشہ قلم کاری مقسوم میں تحریر ہو گیا اور اب یہ نوبت ہے کہ چور کو لاٹھی سے بھگانے کے بجائے ایک خوشامدی خط لکھنا پڑ رہا ہے۔

اب اگر اچانک تم میرے گھر گھس آؤ تو میرے پاس صمد ڈیری فارم کے دودھ کی خالی بوتلوں کے سوائے کیا ہے —— یہ صحیح ہے کہ ایشیا کے ذیلی براعظم میں ہندو مسلم فسادات کے آغاز سے خالی بوتل کو بھی اسلحہ کا درجہ دیدیا گیا ہے مگر اس اسلحہ سے ہندو یا مسلمان ہی مارنا اچھا معلوم ہوتا ہے، چور کو نہیں، یار دوست مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ ایک بندوق خرید لو۔ اگر بندوق خریدنے کے پیسے ہوتے تو اب تک گیبرڈین کا ایک فرسٹ کلاس سوٹ ضرور بنوا لیتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں لائسنس جتنی آسانی سے حاصل کر سکتا ہوں، بندوق نہیں حاصل کر سکتا تلوار سے اس لئے رغبت نہیں کہ زمانہ ایٹم بم کا ہے اور تلوار وطن عزیز کے پرانے قلعوں کے عجائب گھروں میں نیام کردی گئی ہے۔ لاٹھی کا اس لئے تصور نہیں کر سکتا کہ میں خود اپنے والدین کا "عصائے پیری" ہوں اور ان سب باتوں کے باوجود تمہارا مقابلہ اس لئے نہیں کر سکتا کہ عرصۂ دراز

ے میرا سابقہ ایک ایسے چور سے ہے جسے دل کا چور کہتے ہیں۔ مطلب غالباً تم سمجھ گئے ہو گے ــــــ !! کاش تم دل کے چور کی طرح حسین ہوتے !!

میں تمھیں دل کے چور کے مقابلہ میں یا پھر مجموعی طور پر ذلیل کرنے کے لئے یہ خط نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ خط لکھنے کی محرک تمھاری موجودہ روش ہے۔ تم نے کبھی کاہے کو یہ سوچا ہو گا کہ میں نے یا ہم نے چوری کے پیشے کو کتنا ذلیل کر رکھا ہے، میری عزیز بھائی ذرا وہ دور بھی یاد کرو جب کہ چور ہمارے سماج کا ایک بہادر فرد تصور کیا جاتا تھا بغداد کے چور کے بارے میں تو تم بہت کچھ جانتے ہی ہو گے اس پر دنیا کے بڑے بڑے عالی دماغ مصنفوں نے ضخیم اور مبسوط کتابیں تک تحریر کی ہیں اور رہالی وڈ اور بمبئی کی فلم کمپنیوں نے اس کی سوانح عمری کو رنگین اور بے رنگ فلموں تک میں منتقل کر ڈالا ہے میں یہ کبھی مان ہی نہیں سکتا کہ فلم "بغداد کا چور" تم نے نہ دیکھی ہو۔

چلو فی الحال پرانے زمانے کے دوسرے چوروں کو چھوڑ دو۔ صرف بغداد کے چور کو پکڑو اور دیکھو کہ وہ کیا ہے ــــــ ؟ میرا جہاں تک مطالعہ ہے بغداد کے چور کو دراصل اس نظام حیات نے جنم دیا تھا جس میں چند آدمی دنیا کے مالک ہو جاتے ہیں اور باقی سارے آدمی بھوکے مرتے اور غلامی کرتے ہیں اور دونوں کے درمیان ایک شخص اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھتا ہے! کالے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ بادشاہ

کے محل میں گھس کر اس کا خزانہ (بعض اوقات شہزادی بھی) چُرا لے جاتا ہے اور اس کے بعد وہ سارا چرایا ہوا مال (غلط العام میں مال غنیمت) سالے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتا ہے گویا وہ چور نہ ہوا بلکہ امیروں اور غریبوں کے درمیان ایک کھوئی ہوئی کڑی یا (MISSING LINK) ہوا

زمانہ ماضی میں چور کا دنیا کے اقتصادی نظام میں ایک اہم اور تاریخی رول رہا ہے۔ ماضی کے غریب آدمی جب دولتمندوں کے ہاتھوں عاجز آجاتے تھے تو دعائیں کرتے تھے کہ یا اللہ تانتیا چور جیسا کوئی چور ہم میں پیدا کر دے جو ان امیروں اور دولت مندوں کا مزاج درست کر دے۔

ان دنوں انسانی عقل اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی۔ کہ پتہ لگایا جا سکتا کہ اصل میں چور کون ہے؟ امیر آدمی چور ہیں یا تانتیا چور —— چور ہے۔ موجودہ دور میں البتہ بآسانی یہ پتہ لگا لیا گیا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے چور دولتمند آدمی ہیں وہ تانتیا، جگا اور آرسین لوپن کی طرح چوریاں نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی چوری کا طریقہ بے حد عجیب و غریب ہے۔ وہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا مال و متاع حتیٰ کہ ان کی ضروریات زندگی کا سامان تک چرا لیتے ہیں اور کسی کو پتہ تک نہیں چلتا کہ انھوں نے چوری کی ہے انھوں نے اپنی چوریوں کو عجیب و غریب ناموں کے برقعے اوڑھا رکھے ہیں۔ مثلاً ذخیرہ اندوزی محاصل بنکنگ، اجارہ داری، درآمد برآمد، سود خوری وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ برقعے ہیں جو وہ اپنی بی چوری صاحبہ کو وقتاً فوقتاً اوڑھا دیا کرتے ہیں اور وہ تمھاری طرح کوئی بندوق یا چھرا بھی اپنے پاس نہیں رکھتے

بلکہ ان کا ہتھیار تو بڑا چھوٹا ہے معمولی سا ہے یعنی ایک چاندی یا سونے کا سکہ ——— اور اس کی بدولت وہ دن دھاڑے اور رات اندھیرے آٹھوں پہر ہر لمحہ ساری دنیا میں چوریاں کرتے پھرتے ہیں مگر انھیں پکڑنے دھکڑنے والا کوئی نہیں ہے کیونکہ وہ انصاف کی بھی چوری کرتے ہیں قانون کی بھی چوری کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے انسانی زندگی اور ساری دنیا کو چرا لیا ہے۔

میرے اجنبی مہربان دوست ——— یہ بات کچھ کچھ تو تمھاری سمجھ میں آگئی ہوگی اگر نہیں آئی تو کوئی حرج نہیں۔ صرف اتنا ہی یاد رکھو کہ اصلی چور تم نہیں ہو بلکہ اصلی چور دولت مند آدمی ہوتا ہے۔ تم ——— تم تو بار اس کی بھونڈی نقل اتارتے ہو۔

یہ میں جانتا ہوں کہ تم پیدائشی چور نہیں ہو اور نہ دنیا کا کوئی انسان ماں کے پیٹ سے چور پیدا ہوتا ہے، چور تو بنتا ہے پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے شوقیہ چوری کرنے کا پیشہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ احتیاجات زندگی سے محرومیوں نے تمھیں چور بنا دیا ہے۔ تم جو چوری کرتے ہو اسی لئے کرتے ہو کہ تمھیں روزگار نہیں ملتا، رہنے کو مکان، پہننے کو کپڑے، سونے کو بستر اور کھانے کو روٹی نہیں ملتی تم تنگ آکر چوری کرلیتے ہو تمھیں یقین ہوتا ہے کہ اگر نہ پکڑے گئے تو مزے ہی مزے ہیں اور اگر پکڑے گئے تو رہنے کو جیل پہننے کو قیدی کا لباس، سونے کے لئے کمبل اور کھانے کے لئے روٹی تو ملتی ہے ——— قانون اور پولیس تمھیں پکڑنے

کے بعد تم سے چوری کرنے کی وجہ نہیں پوچھتی کہ چور چور سے کبھی نہیں پوچھتا کہ بھئی تم چوری کیوں کرتے ہو؟ ہوتا صرف یہ ہے کہ بڑا چور چھوٹے چور کو چوری کرتے دیکھ کر کبھی نہیں پوچھتا کہ بھئی تم چوری کیوں کرتے ہو؟ —— ہوتا صرف یہ ہے کہ بڑا چور چھوٹے چور کو چوری کرتے دیکھ کر کبھی گوارا نہیں کرتا کہ کوئی اس کے پیشے میں مداخلت کرے، دوسری بات یہ ہے کہ چھوٹا چور اگر بڑے چور کے گھر میں چوری شروع کر دے تو بڑا چور چوری کیوں کرے یعنی ادھر وہ جمع کرے ادھر دوسرا اٹھا لے جائے ایسا وہ کبھی برداشت کر سکتا ہے !!

لیکن یہ سب باتیں بھی پرانے زمانے کی ہیں اس سے تمھارا کوئی تعلق نہیں یعنی یہ باتیں ان چوروں کی ہیں جو صرف دولت مند آدمیوں کے خزانے چرایا کرتے تھے اور غریبوں میں نام پیدا کرتے تھے۔

اب اگر کلرکوں اور ترقی پسند ادیبوں کے گھر بھی چوریاں ہونے لگیں تو پھر سمجھ لو کہ تم چور نہیں۔ بغداد کے چور کی نسل سے نہیں ہو۔ بہرام ڈاکو جیسے بہادر آدمی کا خون تمھاری رگوں میں نہیں دوڑ رہا ہے۔ تم نے لفظ چور پر بٹہ لگا دیا ہے۔ چوری کے پیشے کو کیچڑ میں گرا دیا ہے۔ تم پر میری طرف سے لعنت خدا کی طرف سے پھٹکار اور قانون کی طرف سے جیل نصیب ہو۔

معاف کرنا۔ مجھے ذرا غصہ آ گیا! مجھے اس وقت صرف غصہ ہی آ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہر کمزور شخص غصیلا ہوتا ہے اور تمھارے مقابلے

میں میں یقیناً مگر ور ہوں اب غصّہ بھی تھوک نہیں سکتا اس کے تمھارے تصور ہی سے میرا حلق خشک ہو چلا ہے اب تو نہ پیک تھوک سکتا ہوں اور نہ غصّہ...... بڑی قابل رحم حالت ہے میری۔ نہ سو سکتا ہوں اور نہ جاگ سکتا ہوں۔ طبیعت جھلّا اٹھی ہے۔ اور اسی لیے غصہ کی ایک لہر بھی جسم میں دوڑ گئی ہے ورنہ میں تم پر غصّہ ہو کر کیا کر سکتا ہوں۔ میرا غصہ میری ہی طبیعت ہی میں رہ سکتا ہے

ابھی ابھی کچھ دیر پہلے میری بیوی سوتے سے ہڑبڑا کر جاگ پڑی تھی کہ تم آ گئے۔ غالباً بچاری نے خواب دیکھا ہوگا۔ وہ یہ دیکھ کر کچھ مطمئن تو ہو گئی کہ میں جاگ رہا ہوں لیکن جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میں تمھیں ایک کھلا خط لکھ رہا ہوں تو وہ اور زیادہ گھبرا گئی اس نے کہا :۔

"چور یہ سمجھے۔ کہ ضرور اس شخص کے پاس کچھ نہ کچھ دولت ہے۔ جبھی تو وہ خطوط وغیرہ لکھ کر خوشامد کر رہا ہے کہ میرے گھر نہ آؤ ــــــ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ وہ نہ آنے والا ہو تب بھی آئے گا ــــــ چور کو خط لکھنے کی بجائے آپ پولیس کو خط کیوں نہیں لکھتے"

مجھے اپنی بیوی کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی بچاری واقف ہی نہیں کہ میں کس طرح ہر طرف سے مایوس ہو کر چور ہی کو خط لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں اگر پولیس اس قابل ہوتی کہ وہ راتوں کو ہمارے لیے چین و آرام سے سونے کا انتظام کر سکتی تو میں بھونکنے والا کتا کیوں پاتا۔ باوجود مفلسی کے گھر پر

ایک پٹھان چوکیدار کیوں مقرر کرتا تو اور یہ خط چور کو کیوں لکھتا۔ اب مجھے تو معلوم ہے نہیں مگر محلے والے کہتے ہیں کہ پولیس چوروں سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ پولیس اور چوروں میں مالِ غنیمت کا ساجھا ہوتا ہے۔ اور اکثر و بیشتر چوریاں پولیس ہی کے اشارے پر ہوتی ہیں۔ محلے والوں کا یہ خیال کچھ کچھ مجھے بھی صحیح سا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اپنی دوماہی سزائے قید کے دوران میں جیل کے اکثر قیدیوں نے مجھے حلفیہ بتایا تھا کہ جب تک پولیس کی اعانت شاملِ حال نہ ہو وہ چوریاں نہیں کرتے ـــــ گرفتار اس وقت ہوتے ہیں کہ جب مالِ غنیمت میں سے پولیس کو مجوزہ یا مقرر حصہ نہیں دیتے۔

میں یہاں ساری ذمہ داری صرف پولیس کے سپاہیوں پر نہیں ڈالتا۔ تم اور تمہاری طرح دوسرے چور بھی برابر شریک جرم ہوتے ہیں۔ پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ بھی تمہاری جیسی اور میری جیسی مجبوری شامل ہوتی ہے۔ یعنی بچاروں کو اتنی قلیل تنخواہ اور اتنا کثیر خاندان ملتا ہے۔ کہ کبھی کبھی انسدادِ جرم کی بجائے اعانتِ جرم کا بھی مرتکب ہونا پڑتا ہے۔

اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ پولیس ہماری یا ہمارے جیسے غریب لوگوں کی کوئی نوکر نہیں ہے۔ ہم کوئی اپنی جیب سے انھیں تنخواہ دیتے ہیں کہ وہ رات رات بھر ہمارے گھروں کی چوکیداری کرتی رہے۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ پولیس کو جن سے تنخواہ ملتی ہے وہ ان کی پوری پوری حفاظت اور نگرانی کرتی ہے۔ چنانچہ ہم نے آج تک کبھی یہ نہیں سُنا

کہ کسی پولیس افسر یا کسی بڑے عہدہ دار یا کسی وزیر کے گھر کبھی کوئی چوری ہوئی ہو۔

یہ بات تمہارے لئے سچ مچ بڑی باعثِ شرم ہے کہ ایک کپوت کی طرح نہیں بلکہ سپوت کی طرح تم کچھ دیر کے لئے اپنے اسلاف کے کارناموں پر غور کرو۔ پولیس افسر، عہدہ دار اور وزیر کیا ان سے تو بڑے بڑے بادشاہ اور شہنشاہ تک گھبرایا کرتے تھے۔ انھوں نے پولیس سے اعانت یا مدد حاصل کرنے کو ہمیشہ توہین سمجھا وہ اس کو اپنے پیشے کی مردانگی پر ایک بدنما دھبہ تصور کرتے تھے۔ اس زمانے کا معمولی سا معمولی چور بھی کوتوال کو ڈانٹ دیا کرتا تھا۔ کیا تم نے وہ ضرب المثل نہیں سنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ——— یہ ضرب المثل تمہارے اسلاف کی شجاعت کی ایک بڑی قیمتی یادگار ہے کاش تم بھی "کوتوال کو ڈانٹنے" کی پالیسی پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

بحالت موجودہ بخدا تم سے "دل کے چور" ہی لاکھ درجے معزز ہیں وہ بچارے (یا بچاریاں کیونکہ دل کے چور بالعموم صنفِ نازک سے تعلق رکھتے ہیں) صرف دل چرا لیتے ہیں۔ نظریں چرا لیتے ہیں۔ راتوں کی نیندیں چرا لیتے ہیں۔ فاؤنٹن پن یا گھڑی یا منی پرس تو نہیں چراتے اس مادی دنیا میں دل کا چوری ہو جانا اتنا اذیت ناک نقصان نہیں ہے جتنا کہ فونٹن پن یا کپڑوں کے صندوق کا چوری ہو جانا۔ دل کے چور سے تو خیر شادی وادی کرکے دل پھر واپس لیا جا سکتا ہے۔ لیکن

فاؤنٹین پن یا کپڑے اگر ایک بار گئے تو پھر ان کی واپسی مہاجرین کی واپسی سے کسی طرح کم نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ خط میرے خوف اور ڈر کی طرح کافی طوالت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس لئے اب مجھے اسے ختم کر دینا چاہیے اب میں تمھیں کافی شرم اور غیرت دلا چکا ہوں تمھاری داڑھی کے سارے تنکے چن چکا ہوں (استفادہ از محاورہ چور کی داڑھی میں تنکا) اب تمھیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ "چوری" کی ترکیب استعمال کیا ہے؟ —— اور چوری کے مال کو کس طرح استعمال کرنا چاہیئے میں نے ابھی ابھی اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرا کے تمھاری کافی ذہنی تربیت کی ہے۔ لیکن ایک بات جو تم سے بڑی دیر کہنا چاہتا تھا۔ بلکہ جس کے لئے تمھیں خط لکھ رہا تھا۔ وہ یہ ہے کہ پہلے تم میرے گھر زحمت گوارا نہ کرو دوسرے یہ ہے کہ جہاں کسی بڑے گھر میں چوری کرو تو میرے لئے ایک سٹ واچ لانا کبھی نہ بھولنا۔ عرصہ دراز سے مجھے ایک رسٹ واچ کی ضرورت ہے۔ مفلسی کا یہ عالم ہے کہ برسوں تک خریدنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ میں خود تو چوری کرنے سے قطعاً قاصر ہوں تم اگر میرا اتنا کام کر دو۔ تو مہربانی۔ اچھا اب خدا حافظ —— امید ہے کہ تم مع الخیر ہوں گے

ضروری نوٹ: ایک بات کی تم سے معافی چاہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے تمھیں کالا چور کہہ کر مخاطب کیا ہے ہو سکتا ہے کہ تم کالے نہیں ہو گورے ہو سانولے ہو۔ بہر حال جیسے کچھ بھی ہو لیکن چونکہ دنیا بھر کے چوروں میں کالے چور کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے اسی لئے میں نے تمھیں کالے چور کے نام سے یاد کیا ہے۔ ورنہ میری نیت بری نہیں ہے۔ صرف تمھارا

ابراہیم جلیس